دلّی کی شام
احمد علی
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
اشتراک
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

دلّی کی شام

احمد علی

ترجمہ
بلقیس جہاں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

Dilli Ki Sham
by
Ahmad Ali
Rs.143/-

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۔ 110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی ۔ 400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۔ 202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ 110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ھیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/143 روپے
ISBN:978-81-7587-865-5 سلسلۂ مطبوعات: 1667

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شاندار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرم عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دلچسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلا شرکت غیرے شائع کی ہیں)۔ زیر نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام کے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابل فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ارباب حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُر خلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اولین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

دیباچہ

یہ ناول پہلی بار ہوگارتھ پریس، لندن نے شایع کیا تھا۔ لیکن انگلستان، امریکہ اور دیگر مغربی ممالک، اور ہندوستان میں مقبول ہونے اور غیر معمولی شہرت حاصل کرنے کے باوجود اُردو میں شایع نہیں ہوا۔ اب بلقیس جہاں کا یہ ترجمہ چھپ رہا ہے۔ اس کے بارے میں مجھے صرف اتنا کہنا ہے کہ میں خود اس سے اچھا ترجمہ اُردو میں نہیں

حصّہ اوّل

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحل ہا

— حافظ

شہر پر رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں گلیاں، مکان اور چھتیں بے چین نیند سو رہے تھے جوں جوں گرمی ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی ان کے سانس لمبے اور بھاری ہوتے جاتے تھے۔

دن بھر کی محنت و مشقت سے چور، تھکے ہارے نیم برہنہ انسان کھرّی چارپائیوں پر گلیوں میں اور صحن، کوٹھوں اور راہ گزاروں پر پڑے تھے۔ اِکّا دُکّا اس وقت بھی خوش گپیاں کرتے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے پھر رہے تھے۔ کسی کسی کے ہاتھ میں موتیا کے گجرے تھے۔ پھولوں کی مہک کچھ دور فضا کو معطر کرتی اور پھر گرمی کی حِدّت میں کھو جاتی۔ کتّے غذا کی تلاش میں نالیاں سونگھتے پھرتے۔ بلّیاں دوکانوں کے آگے نکلے ہوئے پٹڑوں کے نیچے سے دبے پاؤں باہر نکلتیں اور دودھ کے ان چھوٹے آبخوروں کو چاٹنے لگتیں جو دودھ پینے کے بعد لوگ پھینک گئے تھے۔ اِدھر اُدھر گلیوں اور چوراہوں پر پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر کتّے لڑ رہے تھے اور بلّیاں غرّا رہی تھیں۔

درو دیوار اور زمین سے گرمی کے بھبکے نکل رہے تھے۔ نالیوں میں سیل اور سڑاند تھی۔ جہاں جہاں موریاں بدروؤں میں آکر ملتیں وہاں سخت تعفن اور غلاظت تھی لیکن پھر بھی انسان ان ہی موریوں پر کھٹیاں ڈالے سو رہے تھے۔

ہر محلے میں جگہ جگہ مسجدیں اپنے سفید سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ان کے گنبد کسی عریاں عورت کی چھاتیوں کی طرح یوں پھیلے ہوئے تھے گویا ستاروں کی سب روشنی اپنی سطح میں جذب کر لیں گے۔ ان کے مینار کہہ رہے تھے کہ خدا واحد اور اکبر ہے۔

دلّی جو قرنوں پہلے کس تمنا اور آرزوؤں سے بسائی گئی، جس کے لیے فتح و نصرت کے مقابلے ہوئے، جس کی خاطر نفرت اور رقابتوں کی معرکہ آرائیاں ہوئیں جس کے لیے نوحے بھی گائے گئے اور شادیانے بھی بجے، جو چھ سات بار اُجڑی اور بسی، آج بھی زندہ و سالم نیند کی آغوش میں پڑی سو رہی ہے۔

یہ سرزمین کبھی شہنشاہوں، تاجداروں، امراء و رؤسا، داستان گو اور شاعروں کا مسکن تھی۔ مگر اب نہ کوئی بادشاہ ہے، نہ محافظ، نہ شاعروں کے قدر دان، یہ پرانے باسی گو آج بھی زندہ ہیں مگر غیروں کے محکوم، اپنا فخر و اقتدار -

از

بادشاہوں کا عروج و زوال دیکھا، کتنے وجود وظہور کے دکھ درد سنے ہیں۔ نزع کی بے تابیوں کی شاہد اور پیدائش کی خوش کن آوازوں کی سامع یہ موت و زیست کا مرقع ہے۔ استحکام اس کی سرشت اور بدلہ اس کی فطرت ہے۔
اس کے افلاک تلے دغا و فریب کے کھیل کھیلے گئے، بے وفائیاں ہوئیں اور اس کی خاک نے شہزادوں کے خون کی لذت چکھی ہے۔ مگر آج بھی ایک عالم کی ہمہ گیر آوازہ دنیا کی آنکھوں کا نور اور جاذبیت کا مرکز ہے۔
پر اب اس کی وہ تابانی اور درخشانی کہاں؟ وہ منتور زمانے ختم ہوئے۔ وہ لوگ رخصت ہو چکے جن کے دم قدم سے یہ آباد تھی؛ جنہوں نے کبھی اس کو آبِ حیات بخشا تھا۔ نہ وہ کورو رہے نہ وہ پانڈو، نہ خلجی۔ کہاں ہیں وہ تیمور؟ کدھر ہیں وہ بابر، وہ ہمایوں، وہ جہانگیر؟ اب کہاں ہے وہ شاہجہان آباد کا بانی؛ کہاں ہے وہ مغموم شاعر بہادر شاہ جو تاجوروں کا آخری کنارا تھا؟ سب موت سے ہمکنار ہو کر خاک سے بغلگیر زمین تلے پڑے ہیں۔ نہ اب جاہ ہے نہ حشم، صرف چند نشانیاں اس عظمتِ رفتہ کی پُرملال کہانیاں سنانے کو باقی ہیں۔ قطب مینار اور ہمایوں کا مقبرہ، لال قلعہ یا جامع مسجد اور ان المناک تغیرات پر نوحہ زن چند اشعار:

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

اس شاعر بادشاہ کی آواز بازگشت بن کے موت کی بے اعتنائی اور خاموشی پورے شہر پر مسلط ہو گئی۔ گلی کوچے ویران ہو گئے اور سڑکوں پر خاک اُڑنے لگی۔ نیم صدی تک اس نے اپنے وقار کو بلند اور اپنی روایات کو برقرار رکھا لیکن اب اس کے تمدن کی پاکیزگی اور معاشرے کی نفاست ملیامیٹ ہو چکی۔ ایک

زمانہ تھا کہ وہ شاعر جس نے اس کے آخری نوحے لکھے ہیں، شکم میں لکھنؤ جاتے ہوئے اس لیے مُہر بہ لب بیٹھا رہا کہ کہیں اس کی زبان نہ بگڑ جائے اور جب مشاعرہ میں لکھنؤ والے اس کی وضع وکس مپرسی پر ہنسے اور وطن پوچھا تو یوں بولا:

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

لیکن وہ شاعر بھی مر چکے اور وہ تہذیب بھی۔ رسّی جل چکی پر اُس کے بل پرانی عظمت کی یاد دلاتے ہیں۔ ادبار اس کی عمارتوں پر چھا چکا اور نکبت و عسرت اس کے گلی کوچوں اور شاہراہوں پر برسنے لگی ہے تاروں کی ہلکی ماندی روشنی میں سارا شہر تاریک و لب مرگ معلوم ہوتا ہے۔ مٹی کے تیل کے چراغ ضرور جل رہے ہیں لیکن ان کا اُجالا راہ گذاروں اور شاہراہوں کے لیے ناکافی ہے اور نہ اس روشنی کو دوبارہ لا سکتا ہے جو کبھی جمنا کے کنارے اور شہر کے قلب میں چراغاں تھی۔ اب تو شہر کسی پٹے پٹائے کتّے کی طرح شکست سے بے پروا رات کی سیاہی میں بے حِس پڑا ہے۔

ایک آدھ دودھ والے کی دوکان اب بھی کھلی ہے۔ کوئی آتا ہے اور دو چار پیسے کا دودھ پیتا ہے اور آب خورے کو پھینک دیتا ہے۔ بلّیاں کونوں کھدروں سے نکل آتی ہیں اور جھوٹے آب خورے کو چاٹنے لگتی ہیں۔ اکا دُکا فقیر بھی ابھی تک دل سوز صدائیں لگاتے، زمین کے پتھروں کو اپنے ڈنڈوں سے

کھٹکھٹاتے اور در در بھرے گیت گاتے بھیک مانگتے پھر رہے ہیں یا ڈیوڑھیوں کے سامنے گڑگڑا رہے ہیں:

"اللہ کے نام دے دے مائی۔ تیرے بچّوں کی خیر۔"

یا کوئی پھول والا بغل میں پھولوں کی ٹوکری دبائے ایک کان پہ ہاتھ رکھے لہک لہک کر آواز لگا رہا ہے:

"پھول لوجی موتیائی کے۔ کیا بہار ہے موتیائی میں۔"

لیکن شہر خاک آلود اور تپتے ہوئے آسمان کے نیچے مضطرب نیند سو رہا ہے۔ شاید ہی کوئی اس وقت پھول خریدتا ہو یا فقیر کو بھیک دیتا ہو۔ وہ پری پیکر معشوقائیں سو چکیں، اور عشّاق جا چکے ہیں۔

صرف تنگ و تاریک گلیاں بساطِ شطرنج کی طرح پُر فریبی سے پھیلی ہوئی ہیں جو اندرون شہر کو کچھ اسی طرح منقطع کرتی چلی جاتی ہیں جس طرح گلیوں کے دونوں طرف بہنے والی نالیاں۔ آگے بڑھ کر یہ راستے اور بھی تنگ ہو جاتے ہیں پھر کسی مکان کے سامنے یا تو ختم ہو جاتے یا آگے بڑھتے ہوئے اور گلیوں کو حسبِ معمول قطع کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان میں ایک دفعہ گھسنے کے بعد دم گھٹ کر موت کا احساس ہونے لگتا ہے۔

ایسی ہی پر اسرار گلیوں کا ایک جال لال کنوئیں سے ہوتا ہوا کوچہ پنڈتاں کے عمق میں جا کر داہنے ہاتھ پر محلہ نیاریان میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس محلہ کی اپنی گلیاں ہیں اور ان کا اپنا جال ہے اور اس جال میں سے ایک شاخ راہِ حیات کی طرح پیچ در پیچ، بل کھاتی ہوئی ہوئی میر نہال کے مکان پر آکے ٹھہر جاتی ہے۔ مقابل میں لکھوری اینٹ کی ایک چار دیواری ہے جس میں صرف ایک پھاٹک نظر آتا ہے۔ جب ڈیوڑھی میں سے ہو کر گھر میں داخل ہو تو اندر کا صحن آجاتا ہے۔ صحن کی سیدھ

میں ایک نیچا کوٹھا ہے اور کوٹھے کے نیچے دُو چھوٹے چھوٹے کمرے، بائیں طرف لال اینٹوں کا چبوترہ ہے اور چبوترے پر محرابدار دُوہرا دالان۔ دالان کے عقب میں اسی کے برابر لمبا شہ نشین اور چبوترے سے ملحق دُو صحنچیاں ہیں اور ڈیوڑھی کے قریب ایک پاخانہ اور مختصر سا غسلخانہ۔ اس کے بعد باورچی خانہ ہے جس کی دیواریں لکڑی کے دھوئیں سے کالی بھٹ ہو چکی ہیں۔ انگنائی کے بیچوں بیچ ایک کھجور کا پُرانا درخت آسمان کی طرف سر بلند کیے کھڑا ہے جس کے لمبے لمبے پتوں نے آسمان کے کچھ حصے کو چھپا کر نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ اس کا تنا بیچ میں سے خمیدہ ہے جو رات کے اندھیرے میں اور بھی بد ہیئت اور سیاہ نظر آتا ہے۔ اس کی جڑ میں مہندی کا ایک پیڑ ہے، جس کی ٹہنیوں پر گوریوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ اس پر دُو مٹی کی کونڈیاں اُن جنگلی کبوتروں اور چڑیوں کے دانے پانی کے لیے تاروں سے لٹک رہی ہیں جنہوں نے دالان کی کارنس اور محرابوں کی سُرخ و سفید بانات کے پردوں میں گھونسلے بنا رکھے ہیں۔

کوٹھے کی دیوار کے پاس تخت ہیں جن پر قند کا فرش بچھا ہے چبوترے اور صحن میں کچھ بان کے پلنگ پڑے ہیں جن پر اُجلی اُجلی سفید چادریں بچھی ہوئی قندیل کی ہلکی ہلکی روشنی میں بہت بھلی لگ رہی ہیں۔

ایک بڑی بی جو پچاس سے اُوپر ہوں گی انگنائی میں پلنگ پر لیٹی ہیں۔ برابر ہی دوسرے پلنگ پر ان کی سب سے چھوٹی بیٹی مہر و زمانی جو چودہ پندرہ برس کی تندرست و توانا لڑکی ہے، لیٹی ہوئی ہے اور اِس ہی کے پاس ان کا تیرہ سالہ بھتیجہ مسرور لیٹا ہوا ہے۔ بیگم نہال نے بیٹی سے کہا:

"اے بی! ساڑھے گیارہ بج گئے ہوں گے تمہارے ابّا ابھی تک نہیں آئے۔ جاؤ تم بھی اب سو جاؤ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"نہیں بی اماں مجھے ابھی نیند نہیں آ رہی، تم جو کہانی سنا رہی تھیں بڑی مزیدار تھی۔ اچھی ایک اور سنا دو نا۔"

پنکھا جھلتے ہوئے بڑی بی بولیں۔ "تم نے آج کافی سن لیں، اب کل کے لیے اٹھا رکھو۔"

مسرور نے پیٹ کے بل لیٹ کے دونوں ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ لیے اور امید بھری آنکھوں سے پھوپی کو دیکھتے ہوئے کہا:

"نہیں پھوپی جان! ایک وہ کہانی اور سنا دیجیے۔ کیا نام تھا اس کا جس میں سانپ بادشاہ بن جاتا ہے۔ مجھے بڑی اچھی لگتی ہے وہ۔"

پھوپی بولیں: "اے چندا کل ہی تو سنائی تھی تجھے راجہ باسط کی کہانی۔"

"نہیں بھئی وہ تو ہم ہزاروں دفعہ سن چکے ہیں بہت پرانی ہے۔"

مہرو زمانی پنکھا ہلاتی ہوئی بولی۔ "اماں ہمیں تو غدر کی باتیں سنا دو۔ غدر میں کیا کیا ہوا تھا۔ ایک بار تم کہہ رہی تھیں کہ فرنگیوں نے سب مسلمانوں کو لوٹ کر شہر بدر کر دیا تھا۔"

"یہ تو لمبی کتھا ہے بیٹی کسی اور دن فرصت سے سناؤں گی۔ اب تمہارے ابا بھی تو بس آتے ہی ہوں گے۔ توبہ گرمی کس بلا کی ہے دم گھٹا جاتا ہے۔"

بچے چپ ہو جاتے ہیں۔ رات بہت ہو گئی تھی اور نیند کے جھونکے ان کو تھپکنے لگے تھے۔ مہرو اپنے بچھونے پر لیٹ کر ستاروں کو دیکھنے لگی۔ اس کے ذہن میں عجیب عجیب خیال آ رہے تھے، بادشاہوں، شہزادوں اور سپاہیوں کے اور ان کے ساتھ ہی ایک انجان آدمی کا جو دور پردیس میں رہتا تھا اور جس کا پیغام مہرو کے لیے آیا تھا۔ وہ کیسا ہوگا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ مہرو نے کبھی اس کو دیکھا تو نہ تھا صرف اتنا سنا تھا کہ وہ شکار کا بہت شوقین ہے۔ بڑے امیر کبیر اور دولت مند لوگ

ہیں۔ اس کا نام معراج ہے۔ نام تو خاصا پیارا ہے۔ لیکن وہ صورت مرتب نہ کرسکی اور معراج اس کو کہانیوں کا وہ خوبصورت اور بہادر شہزادہ معلوم ہونے لگا جس سے شہزادی کو محبت ہوگئی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس کو اپنے ماں باپ بھائی بہن اور گھر چھوٹنے کے خیال نے کچھ افسردہ کردیا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کے آنکھیں بند کرلیں اور دوبارہ اپنے تصوّرات میں کھوگئی یہ سرور کبھی کا سو چکا تھا۔

بیگم نہال اٹھیں، پٹاری قریب کھسکائی پان کا ڈنٹھل توڑ کر کتھا چونا لگایا اور باریک کٹی ہوئی چھالیہ الائچی اور زردہ ڈال کر گلوری منہ میں رکھ لی، پھر لیٹ کر پنکھا جھلنے لگیں اور کبھی کبھی اپنے قریب لیٹی ہوئی بیٹی کو بھی جھلتی جاتی تھیں.....

"اے ہے میرا پنکھا کہاں گیا، بی انجم! کیا تم سو گئیں؟ میرا پنکھا دیکھا ہے؟" کوٹھے پر سے آواز آئی۔

"اے مجھے تمہارے پنکھے کی کیا خبر، ہوگا وہیں کہیں پلنگ پر۔"

"یہاں تو نہیں ہے۔"

"تو پھر نیچے گر گیا ہوگا......"

پھر ایک مکمل سکوت سارے گھر پر چھا گیا۔ لُو کا ایک جھونکا آیا، کھجور کے پتے کھڑکھڑائے، لالٹین کی لَو بھڑکی اور پھر ٹھہر گئی........

شمس کی نئی نویلی دلہن گھر کی بوت بہو جو چبوترے پر اپنے میاں کے پاس سو رہی تھیں اٹھیں اور مٹکے میں سے لوٹا بھر کے پاخانے چلی گئیں جب وہ واپس آکر لیٹیں تو ڈیوڑھی کے کواڑ چرچرائے اور ایک مرد کے کھنکارنے کی آواز آئی بیگم نہال اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ سرہانے سے دوپٹہ کھینچ کر اوڑھ لیا اور ماما کو آواز دی:

"دلچین! اری دلچین! اٹھ میاں آگئے۔"

دلچین جھٹ پٹ اٹھ بیٹھی اور آنکھیں ملتی ہوئی باورچی خانے کی طرف

چلی گئی۔ میر نہال اندر آئے۔ یہ دراز قد اور ڈوہرے بدن کے جامہ زیب آدمی تھے۔ سفید تنزیب کا انگرکھا پہنے ہوئے تھے اور کڑھی ہوئی گول ٹوپی پٹھوں پر بانکپن سے ترچھی رکھی ہوئی تھی۔ ان کی بنی سنوری چڑھی ہوئی سفید ڈاڑھی کی مانگ کا ایک بال بھی بے جگہ نہ تھا۔ ان کے چہرے پر رُعب و دَبدبہ اور ان کی چال میں وجاہت اور شاہانہ وقار تھا۔

"آج تم بغیر کھائے پیے ہی چلے گئے" بیگم نہال نے ذرا تنک کر کہا "کون وقت ہو گیا کب سے راہ دیکھ رہی ہوں۔"

"ابھی تو صرف گیارہ بجے ہیں۔" میر نہال نے دبے لہجے میں جواب دیا۔ گلی کے نکڑ پر گھنٹہ کی آواز آئی تھی۔"

اتنے میں دلچین سینی میں کھانا لے آئی۔ بیگم نہال نے تخت پر دستر خوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ میر نہال نے انگرکھا اُتار کر گاؤ تکیہ پر رکھ دیا۔ جا کر ہاتھ دھوئے اور اُکڑوں بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔ بیگم نہال قریب بیٹھی پنکھا جھلنے لگیں اور پھر میاں سے بولیں:

"اصغر اللہ رکھے بائیسویں میں ہے۔ اب تمہیں اس کے بیاہ کی فکر کرنی چاہیے خدانہ کرے کہیں ایسے ویسے فعلوں میں نہ پڑ جائے۔"

"میں خود تم سے کہنے والا تھا۔ کیا سو گیا؟"

"نہیں کھانا کھا کر کہیں گیا ہے۔ ابھی تک نہیں آیا۔"

"صاحبزادے تشریف لے کہاں گئے ہیں؟" میر نہال نے پوچھا۔

"لو اور سُنو! مجھے کیا خبر۔ کسی بھائی وائی کے گھر گیا ہو گا۔"

"جی نہیں آپ کے چہیتے اپنے رشتے داروں میں نہیں جایا کرتے۔" میر نہال ذرا برہم ہو کر بولے: "بس وہیں ہوں گے مرزا شہباز بیگ کے ہاں میں نے

ہزار بار کہہ چکا ہوں مجھے اس کا بندو سے یارانہ قطعی پسند نہیں ہے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے اس کو جا و بیجا ڈھیل دے رکھی ہے۔ جہاں سینگ سماتے ہیں منہ اٹھا کر چلا جاتا ہے، جن ہما شما سے جی چاہتا ہے ملتا ہے اور اماں جان ہیں کہ ہوں سے توں نہیں کرتیں۔"

بیگم نہال بولیں "اوئی تم تو مجھ ہی پر برس پڑے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ پھر مرد ذات۔ کیا چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جائے؟ اپنے ہم عمروں سے نہیں ملے گا تو کیا بڈھے کھڈوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے گا؟ بندو اور وہ بچپن سے ساتھ پڑھے ہیں اور پھر تمہارا بھانجا اشفاق بھی تو وہیں رہتا ہے۔ اس کے پاس چلا جاتا ہوگا۔"

میر نہال نے دھیمے پڑتے ہوئے جواب دیا:

"مگر تم کو خوب معلوم ہے اشفاق کی شادی مرزا شہباز کے ہاں میری مرضی کے خلاف ہوئی اور نہ مجھے اصغر کا میل جول بندو سے ایک آن گوارا ہے۔ تم اس کو منع کیوں نہیں کرتیں آخر؟"

اس مرتبہ بیگم نہال تیز ہوتے ہوئے کہنے لگیں:

"الا بلا بگردنِ ملّا! ہر بات میں تم مجھ ہی کو قصوروار ٹھہراتے ہو۔ تمہاری ان باتوں سے تو میرے مرچیں لگتی ہیں۔ آخر وہ تمہارا بھی تو بیٹا ہے۔ تم خود کیوں نہیں کہتے، اور اسی لیے میں اس کی شادی کا کہہ رہی تھی۔" پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے بولیں۔ "تم اللہ رکھے باہر کے پھرنے والے۔ گھر کی تمہیں خبر نہیں۔ میری جان کو ایک فکر ہو تو کہوں، سیکڑوں غم لگے ہیں۔ تمہاری مہر وہی کا فکر کھائے جاتا ہے۔ لو تم سے کہنا ہی بھول گئی۔" پھر انھوں نے مڑ کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جو بے خبر سو رہی تھی۔ جوں ہی وہ مڑیں لالٹین کی روشنی ان کے چہرے پر پڑی اور ان کی محراب دار پیشانی پر تین بل نمایاں ہو گئے۔ "ہاں تو میں کہہ رہی تھی بھوپال سے خط

آیا ہے ۔اُن لوگوں کو جلدی ہے۔"

میر نہال کی تیوری چڑھ گئی اور انھوں نے گردن اٹھا کر بیوی کو دیکھا۔ اُن کے سُرخ و سفید چہرے پر تفکر کے آثار پیدا ہو گئے۔

"تمھیں اِس کی آخر ایسی کیا جلدی پڑی ہے۔ مہرو ابھی بچّہ ہے۔ پردیس کا معاملہ ہے۔ ٹھونک بجا کر دیکھ لینا چاہیے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ وہ لوگ میری سمجھ میں تو آئے نہیں۔"

بیگم نہال کہنے لگیں: "لو جلدی کی بھی خوب کہی۔ بچّوں کا بیاہ کوئی گڈّے گڑیا کا تو کھیل ہے نہیں۔ آخر دو چار برتن بھانڈے گہنے پاتے کا بھی انتظام کرنا پڑے گا اور تم تو جو پیغام آتا ہے اُسی میں ہندی کی چندی نکالنے لگتے ہو۔ ساری دُنیا اُن کے گُن گاتی ہے۔ میر وہاج الدین کی جائداد ہی کوئی لاکھ سوا لاکھ کی ہے۔ سُننے والے تو مہرو کی تقدیر پر رشک کرتے ہیں۔"

میر نہال بیوی کو سمجھانے لگے!

"مگر ذرا یہ تو سوچو اصغر بڑا ہے۔ مہرو کی شادی بھلا اس سے پہلے کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے بھی کوئی لڑکی ڈھونڈی؟"

"ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟ لڑکیوں کا کوئی کال ہے؟ کُنبے ہی میں ہزاروں ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں۔ مگر تم سے آج کہتی ہوں میری نظر تو ہمیشہ سے بھائی نصیر الدین کی چھوٹی بیٹی پر ہے۔"

میر نہال نے ہوں کی اور کہا:

"تم نے اصغر کو بھی ٹٹولا، کیا کہتا ہے اس کے بارے میں؟"

اتنے میں جال میں کبوتروں کے زور زور سے پھڑپھڑانے کی آواز آئی اور میر نہال نے کان اُدھر لگا کر کہا: "کیا چیز ہے؟"

"ہوگی کوئی بلی ولی۔"

جانور پھر پھڑپھڑائے۔ میر نہال نے لالٹین اٹھائی اور کبوتروں کے جال کی طرف لپکے۔ قریب پہنچ کر جال کی پتواروں میں روشنی ڈالی۔ مگر کوئی چیز بھی دکھائی نہیں دی۔ وہ پلٹنے ہی تھے کہ کبوتروں نے پھر پھڑپھڑانا شروع کیا۔ میر نہال نے جال کا دروازہ کھول کر لالٹین کی روشنی میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک کابک کے پیچھے کالی رسی چلتی ہوئی دکھائی دی۔

"سانپ ہے سانپ!" میر نہال چلائے: "دلچین! لائیو میرا ڈنڈا!"

دلچین بدحواس ہو کر ڈنڈا لانے کوٹھری میں گھسی اور اس کے ساتھ ہی دالان میں کسی کے گرنے کی جھنکار اور ایک عورت کی ڈری ہوئی "اوئی" سنائی دی۔ اتنی دیر میں سانپ ایک کابک سے نکل کر دوسری کے نیچے چلا گیا۔

"جلدی لا دلچین! جلدی لا!" میر نہال نے پھر چیخ کر کہا۔

دلچین گھبراہٹ میں ایک کنڈالی سے ٹھوکر کھاتی ہوئی ڈنڈا لے کر پہنچی۔ سانپ کو باہر نکالنے کے لیے میر نہال نے کابک پرے سرکائی مگر وہ سر سے انگنائی میں پہنچ گیا۔ میر نہال تیزی سے باہر نکل آئے اور اس کے پیچھے دوڑے۔ بیشتر اس کے کہ وہ اس پر ایک وار کریں سانپ موری میں گھس گیا۔ میر نہال نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ اپنا پورا ہاتھ موری میں ڈال دیا۔ تخت پر سے بیگم نہال چلائیں۔

"ہائے ہائے، ایسا غضب نہ کرنا!" اور وہ جلدی جلدی یکیدون کیدا پڑھ کر سانپ کو کیلنے لگیں۔

لیکن میر نہال نے سانپ کی دم پکڑ کر اسے باہر کھینچ لیا اور اس زور کا جھٹکا دیا کہ اس کی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ سانپ تڑپتا رہا مگر آگے نہ بڑھ سکا۔ میر نہال نے ڈنڈے سے اس کا پھن کچل دیا۔ تھوڑی دیر تو سانپ بل کھاتا رہا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔

کوٹھے پر سے میر نہال کی بھاوج جمال بیگم نے پوچھا:

"ہے ہے کیا تھا؟"

"کچھ نہیں بھابی جان، سانپ تھا۔ میں نے مار دیا۔" یہ کہہ کر میر نہال مسکرائے اور خوشی سے ان کی باچھیں کِھل گئیں۔

"اللہ نے بڑی خیر کرلی۔"

شمس بھی شور سے اُٹھ گیا اور سانپ کو دیکھتے آ پہنچا۔ دِلچین نے جو ابھی تک سانپ کو اُلٹ پلٹ رہی تھی شمس کو ساری داستان سُنائی۔ میر نہال مسکراتے ہوئے جالی کے اندر گھُس گئے اور کبوتروں کو دیکھنے لگے۔ ان کے شیرازی کے ایک پٹھے کو سانپ نے ڈس لیا تھا اس کا انھیں بہت قلق ہوا۔ کیونکہ کئی جھول ضایع ہونے کے بعد یہ ایک بچا تھا۔ کبوتر کو ٹھیے پر ڈال کے میر نہال ہاتھ دھو کر کھانا ختم کرنے بیٹھ گئے۔ کھانے سے فارغ ہوکر انگرکھا سنبھال کے بیٹھک کی طرف چل دیے۔ جیسے ہی ڈیوڑھی میں پہنچے اصغر چوروں کی طرح دبے پاؤں آتا دکھائی دیا۔ اصغر خوبرو تھا۔ چوڑا سینہ متناسب ہاتھ پاؤں اور نکلتا ہوا قد۔ اس وقت اس کے بالوں میں تیل پڑا ہوا تھا، کلائی میں موتیا کا کنٹھا تھا، اور سر پر ترکی ٹوپی بڑی ادا سے اوڑھ رکھی تھی۔ شیروانی کے اُوپر کے بٹن کھُلے ہوئے تھے جس میں سے انگریزی کالر کی رنگین قمیص دکھائی دے رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مردانہ حُسن سے زیادہ نسوانیت کا احساس ہوتا تھا۔ میر نہال تھم گئے اور بگڑ کر بولے:

"کیا شریفوں کے بچے کہیں آدھی راتوں کو گھروں میں گھُستے ہیں؟ کہاں غائب رہتے ہو؟ تمہارے لچھن مجھے اچھے نظر نہیں آرہے۔ دُنیا بھر کے لُچے لفنگے آپ کے یار ہیں۔ تم سمجھتے ہو جیسے ابّا کو کچھ خبر ہی نہیں۔ باوا دادا کا نام

خوب روشن کر دگے۔"

اصغر کچھ دیر گردن جھکائے کھڑا رہا۔ جب اندر جانے کو بڑھا تو اُس کے ولایتی بوٹ چرچرائے اور میر نہال جاتے جاتے رُکے اور پھر اصغر سے کہنے لگے:

"تمہیں معلوم ہے مجھے ان انگریزی جوتوں سے چڑ ہے۔ نہ ادب رہا نہ لحاظ۔ باپ کے کہنے کو اس کان سُنا اُس کان اُڑا دیا۔ میر نہال کا بیٹا اور انگریزی بوٹ میں اکڑتا پھرے۔ ذرا گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھو۔ کس کا خون ہو۔ میری اولاد اور یہ طور! کان کھول کر سُن لو میاں صاحبزادے! جب تک میں زندہ ہوں تمہاری فرنگلیت اس گھر میں نہیں چلے گی۔ جاؤ پھینکو ابھی ان جوتوں کو۔ بس آخری بار کہہ رہا ہوں۔ آئندہ کسی قسم کی بے راہ روی میں نہ دیکھوں ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

میر نہال باہر چل دیے۔ اصغر کھسیانا سا ہو گیا۔ اُس نے چپکے سے لالٹین اٹھائی اور کمرے کا رُخ کیا چبوترے پر سے کسی عورت کی کھسر پُھسر سنائی دی:

"رہنے دو یہ چونچلے۔ وقت دیکھو نہ محل۔"

اصغر کمرے سے نکل آیا۔ کھجور کے پتوں میں ہوا سرسرائی۔ ایک تارا ٹوٹ کر سُرخ روشنی چھوڑتا ہوا زمین کی طرف گِرا اور کھجور کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گیا اور رات کی تاریکی تمام دُنیا پر پھیل گئی۔

۳

اصغر چھت پر اکیلا سوتا تھا۔ وہ اوپر جا کر اپنے بچھونے پر لیٹ گیا گرمی سخت تھی اور ہوا بالکل بند۔ ایک پتہ تک نہ ہلتا تھا۔ وہ گرمی سے بے چین اِدھر اُدھر کروٹیں بدلتا رہا۔ کبھی اُٹھ کر پانی پیتا، کبھی آنکھیں زور سے بھینچ کر لیٹ جاتا۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی اور خیالات اسی طرح منتشر۔

جب رات ڈھلنے لگی تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سرسرائی اور اصغر آسمان کو ٹکٹکی باندھ کر تکنے لگا۔ اَن گِنت ستاروں کے جھرمٹ جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ چھوٹے بڑے ستارے الگ الگ شان و شوکت سے یوں چمک رہے تھے گویا اپنا دربار سجائے بیٹھے ہوں۔ ہر ستارا ایک دوسرے پر خندہ زن تھا اور ہر ایک سلطنت گردوں لوٹ لینا چاہتا تھا۔ ستاروں کی چشمک اسی طرح چلی جا رہی تھی۔ نور کے ننھے ننھے خدنگے ہر طرف برس رہے تھے جن کی ضیا پاشی نے فضائے آسمانی کو حسین و دلفریب بنا دیا تھا۔

ہر وضع قطع کے ستارے جڑاؤ زیوروں کی طرح یوں جھلمل جھلمل کر رہے تھے، جیسے کسی ہار کے موتی یا کسی حسینہ کے ماتھے کا جھومر۔ سات سہیلیوں کا جھمکا عین اصغر کے سر پہ جگر جگر کر رہا تھا اور اس کا بڑا ستارا کسی کے ماتھے کی بِندیا کی طرح چمک رہا تھا۔
آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ جدھر بھی نگاہ جاتی تھی تارے ہی تارے تھے، اور ہر ستارے میں ایک دلکش دنیا آباد تھی۔ گویا ہر ستارا اپنی جگہ ایک حسین دوشیزہ تھا ان کی جادو بھری دنیا میں اصغر کچھ ایسا کھویا کہ اس کو نہ اپنا ہوش رہا نہ دنیا و مافیہا کی خبر۔ ایک کشش تھی جو اس کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ اور وہ آہستہ آہستہ بادِ سحر کے پر دوش پر خلا کی پنہائیوں میں ایک آزاد پرندے کی طرح بے تکان اُڑنے لگا۔ وہ ابھی مصروفِ پرواز ہی تھا کہ رفعتیں کم ہونے لگیں اور زمردی جہاں اس کے قریب تر آنے لگے۔ ہر ستارے کی حسینہ مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی، انوار کی تجلیاں فضا میں بکھر جاتیں اور اصغر کی پرواز زیادہ تیز ہو جاتی۔ پھر جیسے ہی ایک شوخ چشم حسینہ نے اُسے اپنی طرف بُلایا، ستاروں نے اپنے محور چھوڑ دیے اور اس کی طرف اُترنے لگے اور جوں جوں نیچے اترتے بڑے ہوتے جاتے تھے۔ اصغر پر ایک نامعلوم سا خوف چھا گیا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کی۔ لیکن ستارے بھی اُسی تیزی سے گردش کرتے ہوئے بڑھنے لگے، یہاں تک کہ زمرد کی بڑی بڑی چٹانیں دکھائی دینے لگیں۔ یہ سبز چٹانیں اس کی طرف ایک ایک کر کے لگاتار اُترنی شروع ہوئیں اور اس کے اتنے پاس آ گئیں کہ اصغر کی نگاہوں سے آسمان اوجھل ہو گیا اور یہاں سے وہاں تک صرف لاجوردی پہاڑ ہی پہاڑ نظر آتے تھے۔ وہ ڈرا اور دہشت سے تھر تھر کانپنے لگا۔ بے دم ہو کر وہ زمین کی طرف گرنے لگا اور دل تھا کہ ڈوبا جاتا تھا خوف سے۔ مجبور وہ بے کراں خلا میں معلق تھا۔ اِرد گرد سہارے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔
ایک حد پہ آ کر چٹانیں ٹھہر گئیں اور وہ خود بھی گرتے گرتے رُک گیا ——

ٹھہرتے ہی ہمت اور شوق بھی بڑھ گئے۔ چنانچہ وہ پھر بلندیوں کی طرف مائلِ پرواز
ہوگیا۔ ستاروں کا بڑا ہونا اور اُترنا ختم ہو چکا تھا اور وہ آسمان کی رفعتوں میں
آزادانہ اِدھر سے اُدھر اُڑنے لگا۔ اُڑتے اُڑتے وہ ستاروں کی لاجوردی دنیا میں
پہنچ گیا۔ کوکب و انجم اس کے چاروں طرف جمع ہوگئے۔ درخشاں اور پری چہرہ
شہزادیاں کرنوں کا لباس پہنے ستاروں میں سے رقص کرتی ہوئی نکلیں اور اصغر کو اپنے
حلقے میں لے لیا۔ اُن کے بدن سیمیں اور سڈول تھے۔ اُن کی آنکھیں بڑی بڑی اور
روشن تھیں۔ ان آنکھوں میں بے پایاں مسرت کے پیغام تھے اور نشاطِ ابدی کی
دعوت۔ ان کے سیاہ بال ہوا کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ اُن کا رقص مستانہ تھا جس
کی ہر حرکت اور بھاؤ کے ساتھ اُن کے سینے مدوجزر کی طرح ڈوبتے اور اُبھرتے تھے۔
ہر ہر طرح سے وہ اس کو لبھاتیں، رجھاتیں اور دعوتِ رقص دیتیں۔ لیکن ہجومِ حسن و
رعنائی سے وہ ایسا محوِ حیرت تھا کہ ناچنے کا خیال بھی اُس کے دل میں نہ آیا۔ لیکن پھر آپ
ہی آپ اُس کے ہاتھ اور پیر والہانہ انداز سے جنبش میں آگئے۔ وہ کشاں کشاں ان کے

بند ہوگئیں۔

دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو کہکشاں آسمان پر اس سرے سے اُس سرے تک ایک تابناک لکیر کی طرح کہیں سے کشادہ کہیں سے پتلی ہوتی ہوئی دور اُفق تک چلی گئی تھی اور اُسے وہ واقعہ یاد آگیا جب رسول اللہ کہکشاں پر چلتے ہوئے عشق کی اس لافانی ساعت کے لیے فردوس بریں پہنچے تھے، اور آپ کے قدموں نے اس راہ گزر کو جو انھیں خدا تک لے گئی تھی متبرک و درخشندہ کردیا تھا۔ اور اصغر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خود بھی کہکشاں پر چلتا چلا جا رہا ہو۔ اس سے بہت آگے کہکشاں کی متوازی منوّر راہ پر ایک پری پیکر بال بکھیرے قدسیانہ شان سے چلی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی اُس نے بلقیس کو پہچان لیا۔ جذبۂ محبت سے اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اور وہ بھی قدم بڑھا کر اُس کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دوش بدوش کیف و مستی سے مخمور آگے بڑھتے رہے لیکن اُفق کا کنارا نزدیک آچکا تھا اور راہ گزرِ کہکشاں ختم ہوگئی جس کے آگے سوائے ایک عمیق اور تاریک خلا کے کچھ اور نہ تھا۔ جب اس کی نگاہ اس پُرہول اور بے پایاں گہرائی پر پڑی تو اس کا سر چکرانے لگا اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں آگئیں۔ کچھ کہنے کو وہ بلقیس کی طرف مڑا لیکن وہاں نہ بلقیس تھی نہ کوئی دوسرا اور وہ اس لامحدود خلا کے کنارے وہ تن تنہا ظلمتوں میں حیران و پریشان کھڑا تھا.....

اسی اثنا میں ایک بڑا ستارا جو اور ستاروں سے کہیں زیادہ روشن تھا اس کی طرف بڑھا اور اصغر کے قریب پہنچ کر مسکرانے لگا۔ پھر ایک ماہ وش دوشیزہ کا روپ لے کر اس نے اصغر کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ جب یہ دونوں قریب ہوئے تو اُسے بلقیس کا دل آویز چہرہ نظر آیا۔ یکایک وہ اُس سے ہم آغوش ہوگیا۔ ان کے ہونٹ ایک دوسرے سے مل گئے اور اصغر

ایک روحانی لذّت اور سرخوشی سے سرشار تھا۔ جو اِس دنیا میں میسّر نہیں ......

اصغر نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے ہونٹوں پر ابھی تک ہلکی سی لرزش تھی۔

آسمان پر کاروانِ کہکشاں جا چکا تھا۔ صرف ایک بڑا سبز ستارا اُفق کے کنارے پر جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور اصغر ستاروں کے روشن تصور میں غافل سو گیا۔

۳

نثار احمد کی پُر از شان و شکوہ اذان نے دُنیا کو عالمِ خواب سے بیدار کر دیا۔ ان کی دلنشین آواز ہلکورے لیتی ہوئی کسی نغمہ کی طرح گونج اُٹھی اور ایمان والوں کے لیے عبادت کی دعوت اور پیامِ امید و سرخوشی لیے ہوئے گلی کوچوں میں بلند ہوئی اور دُور دُور پھیل گئی۔ ابھی شب کی تیرگی باقی تھی اور افق پر انجم فروزاں، لیکن مشرقی گوشوں میں آثارِ زندگی ہویدا ہو چلے تھے۔

نیند سے چُور لوگوں نے شیریں خوابوں میں اُن کی آواز سُنی۔ کچھ کلبلائے نیم بیدار ہوئے اور پھر لذتِ شبانہ کی سرمستیوں میں گُم ہو گئے۔ کچھ آنکھیں مَلتے ہوئے اُٹھ بیٹھے اور نماز کی تیاریاں کرنے لگے۔

اذان کے ساتھ ہی ساتھ چڑیاں بھی ایک ایک دو دو کر کے جاگ اُٹھیں اور چُوں چُوں کر کے وہ شور مچانے لگیں کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کا غل اَبدی ہے اور کبھی ختم نہ ہوگا۔ کتے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے اور کھانے کی تلاش میں زمین کو

سونگھنے اور گندگی میں تھوتھنیاں ڈالنے لگے۔

رفتہ رفتہ ہلکی سبز روشنی سارے جہان میں پھیل گئی۔ ستارے ماند پڑ گئے، پل بھر کو ٹمٹمائے اور اپنے چہروں کو دامنِ سحر میں چھپا لیا۔ ان کے اوجھل ہوتے ہی زمین کے تاریک کونوں میں بھی اجالا پھیل گیا۔ شوخ آفتاب نے بڑھ کر زمین کو جھانکا اور اس کی رنگ برنگی کرنیں جمنا کے سینے پر مچل گئیں پانی میں گلابی، سرخ اور اودے رنگ دمک اٹھے، اس کی شعاعیں جامع مسجد کے اونچے میناروں کو چومتی ہوئی سنگِ مرمر کے گنبدوں پر منعکس ہوئیں اور گمٹیوں اور عمارتوں پر پھیل گئیں اور سارے شہر میں روشنی کا سیلاب امنڈ آیا۔

آسمان کبوتروں کی ٹکڑیوں سے ڈھک گیا۔ ان کے غول ہر سمت میں اڑتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ یہ غول ایک دوسرے سے لڑتے تھوڑی دیر تک کاوے کاٹتے پھر ان میں سے ٹکڑیاں کٹ کٹ کر الگ ہو جاتیں اور کبوتر پر جوڑ جوڑ کر اپنی اپنی چھتوں پر اتر جاتے۔ کبوتر بازوں کی آؤ آؤ اور کوہا کا مستقل شور ہر طرف سنائی دیتا تھا۔

چھتوں پر یہ دھوم تھی اور نیچے گلی کوچوں میں چینے والے میلے کچیلے کپڑے پہنے، کمر پر جھولے ڈالے چینے بیچتے پھر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ہی فقیر بھی آنے شروع ہو گئے۔ کوئی اکیلا آتا تو کچھ ٹولیوں میں۔ کوئی شعر گاتا تو کوئی کشکول جھنکاتا اور کوئی دست پناہ بجا بجا کر آٹے، روٹی یا پیسے کی صدا لگاتا۔ دھمال ڈال کر جھومتے، دائیں بائیں پیر پٹخ کر کودتے، سر دھنتے اور دھما دھم موصلی بجا بجا کر زور زور سے گاتے:

دھم قلندر اللہ ہی دے گا۔ دودھ ملیدہ اللہ ہی دے گا
شکر شیرہ اللہ ہی دے گا۔ دھم قلندر اللہ ہی دے گا

بوڑھا جوان ہر رنگ کا فقیر آتا اور ہر ایک کی وضع نرالی ہوتی۔ گورے کالے،

ڈِھیل، سنڈ مُسنڈ، بے ڈاڑھی مونچھ، کسی کے سر پر کلاہ تو کسی کے سَر پر کنٹوپ یا کوڑیاں ٹکی ہوئی ٹوپی ہوتی۔ کسی کا سر گھٹا ہوتا تو کوئی زلفیں بکھیرے ہاتھوں اور گلوں میں رنگ برنگی پتھر کے موتیوں کی مالائیں ڈالے کلائیوں میں کڑے اور پاؤں میں جھانجن پہنے کوئی کمبل پوش تھا تو کسی کی قبا کے دامن ہوا میں لہراتے، کسی کا پیراہن ٹاٹ کا ہوتا اور کوئی پیوند پارے کی گدڑی کاندھے پر ڈالے یا میلی تہہ بند باندھے ہوئے۔ مکانوں کے دروازے کھلتے، ٹاٹ کے پردے ہٹتے اور کسی نازک اندام کے گورے گورے ہاتھ یا تو فقیر کو پیسے دیتے یا باسی کوسی کھانا اس کی طرف بڑھا دیتے۔ فقیر گھر والوں کو نام بنام دعائیں دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔

مرد اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو گئے۔ گلیوں میں چاندی کے ورق کوٹنے کی آوازیں اس طرح آنے لگیں جیسے بھری ہوئی بوتلوں کے کاک یکے بعد دیگرے کھل رہے ہوں اور ان آوازوں کے ساتھ ٹین والوں نے بھی زور زور سے چادریں پیٹنی اور ٹھنا ٹھن شروع کر دی۔ شہر میں محنت اور مشقت کا آغاز ہوتے ہی ہر سمت سے شور و شغب کی آوازیں گونج اٹھیں اور زندگی کی پیہم جد و جہد شروع ہو گئی۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

بیگم نہال منہ اندھیرے ہی جاگ اٹھیں۔ نماز سے فارغ ہو کر تخت پر ہل ہل کے تلاوت کرنے لگیں۔ مہرو بھی اُٹھ گئی تھی اور پیڑھے پر بیٹھی منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ مسرور مدرسے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ البتہ شمس ابھی تک سو رہے تھے اور ان کی دُلہن پاخانے میں تھیں۔ کوٹھے پر جمال بیگم اپنی بیوہ بھاوج پر غصے ہو رہی تھیں:

"بی انجم! تم نے تو میری زندگی اجیرن کر دی۔ مجھ بدنصیب کو نہ دن چین

ہے نزلات......"

اتنے میں چنے والے کی آواز آئی۔ بیگم نہال پڑھتے پڑھتے ٹھہر گئیں اور مڑکر منہ ہی منہ میں ہُوں ہُوں کرنے لگیں۔ دلچین باورچی خانہ میں بیٹھی دیگچی کا پیندا جونے سے مانجھ رہی تھی۔ بیگم نہال کی ہُوں ہُوں سُن کر اٹھی اور بڑبڑاتی ہوئی کہ "مجھ کو موت بھی نہیں آتی" اُن کے پاس آئی۔ بیگم نہال نے اِزار بند میں سے ایک پیسہ کھول کے اس کو دیا، اور چنے والے کی آواز کی طرف اشارہ کیا۔

مسرور میلی اچکن اور چیکٹ انر کی ٹوپی اوڑھے ہوئے کمرے میں سے نکلا اور بستہ بغل میں دبا مدرسہ چل دیا۔ مہرو نماز میں مشغول ہوگئی، اور شمس کی دُلہن پاخانہ سے نکل کر غسلخانہ میں گھس گئیں اور کوئلے سے دانت مانجھنے لگیں۔

مہندی پر گوریاں چوں چوں کر رہی تھیں اور کھجور کے درخت پر ایک کوّے نے کائیں کائیں کی برابر رٹ لگا رکھی تھی۔

* * * * * *

میر نہال کے اُڑان کبوتر کوٹھے پر پلے ہوئے تھے۔ انھوں نے جا کر کبوتر کھولے۔ وہ ابھی جال میں سے نکلے ہی تھے کہ چھیپی لے میر نہال اُن کی طرف لپکے، اور زور سے ہش کُو کی آواز لگائی۔ کبوتر اُڑ گئے۔ اُن کی ٹکڑی میں ہر طرح کے جانور تھے، کاسنی اور لال بند، کھیرے اور چپ، جنگلے اور شیرازی۔ کبوتروں نے چھت کا چکر لیا پھر جھنڈی کا اشارہ دیکھ کر مشرق کی سمت تیر کی طرح چل دیے جہاں خواجہ اشرف علی کے رنگین اُڑ رہے تھے۔ خواجہ صاحب کی ٹکڑی کے قریب پہنچتے ہی انھوں نے ایک کڑی لی اور ان کے کبوتروں سمیت پلٹ گئے اور فوراً گھر کا رُخ کیا۔ انھیں آتا دیکھ کر میر نہال نے دو انگلیاں منہ میں ڈالیں اور سیٹی بجانے لگے۔ آواز سنتے ہی کبوتروں نے رُخ پھیرا اور دُور نکل گئے۔

خواجہ اشرف علی گلا پھاڑ پھاڑ کے آؤ، آؤ چلانے لگے۔ لیکن ان کے کبوتروں کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ میر صاحب کی ٹکڑی خواجہ صاحب کے کبوتروں کو لپیٹے دور اور کبوتروں سے کشتی کرتی ہوئی اور جھگڑوں سے لڑتی یہاں تک کہ کبوتروں کا ایک غول ہوگیا جو دور پہنچ کر صرف ایک نقطہ سا دکھائی دینے لگا۔ دوسرے کبوتر باز بھی چلا چلا کر اپنے کبوتروں کو بلا رہے تھے۔ بہت سے کٹ کٹ کر اس غول سے الگ ہوتے اور پر جوڑ کر اپنی اپنی چھتوں پر اتر جاتے۔ خواجہ صاحب کے بھی دو تین گرداں کبوتر لوٹ آئے لیکن باقی اس غول میں ملے ہوئے ابھی تک دور اڑ رہے تھے۔ میر نہال نے سیٹی بجانی بند کر دی اور بیٹھ کر اپنے کبوتروں کی طرف دیکھنے لگے۔ خواجہ صاحب اپنے کوٹھے کی منڈیر پر سے اچک اچک کر کبوتروں کو دیکھ رہے تھے اور چلا چلا کر انھیں بلا رہے تھے۔

بہت دیر کے بعد دور مٹیول پر ایک دھبہ سا دکھائی دیا اور جوں جوں یہ قریب آیا آؤ آؤ کی آوازیں اور بھی زور زور سے آنے لگیں۔ جیسے ہی غول میر نہال کی چھت کے قریب پہنچا خواجہ اشرف علی نے بولا کر اور بھی زور سے گلا پھاڑنا اور آؤ بیٹھا کرنا شروع کر دیا، اور پانی کے بجائے مٹھیاں بھر بھر کے دانا اچھالنے لگے۔ جب غول میر نہال کی چھت پر پہنچا تو انھوں نے ہنڈیا میں سے پانی لے کر اچھالا اور ایک ٹکڑی ہی چھت پر اتر آئی۔ لیکن دوسروں کے بہت سے کبوتر کٹ کٹ کے نکل گئے۔ چھوٹی سی ٹکڑی تو خواجہ صاحب کے ہاں پہنچی مگر باقی دوسری طرف چلے گئے۔ میر نہال نے کبوتروں پر نگاہ ڈالی۔ کئی ایک نئے کبوتر ڈرتے ڈرتے دانا اٹھا رہے تھے۔ میر نہال ایک فاتحانہ انداز سے مسکرائے اور جال کے اندر دانا پھینکا۔ بھوک کے مارے کبوتر اندر چلے گئے میر نہال نے پٹ دروازہ بند کر دیا اور نیوں کو پکڑ پکڑ کے برابر کے جال میں ڈال

اپنے کبوتروں کو دوبارہ کھول دیا۔

خواجہ اشرف علی ابھی تک کھڑے میر نہال کی طرف دیکھ رہے تھے اور دھوپ میں ان کا تام ڑا سر آئینہ کی طرح چمک رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب اُن کا کوئی بھولا بھٹکا کبوتر نظر آتا تو اُسے آؤ آؤ کر کے بلاتے۔ میر نہال اپنے کبوتروں کو ہکیناؤ دینے لگے۔ دوسرے کبوتر باز ابھی تک اسی طرح ہاکو ہاکو کر رہے تھے۔ چار سو کبوتر ہی کبوتر تھے اور ان کے پروں سے آسمان چھپ گیا تھا۔

لیکن جوں جوں گرمی میں اضافہ ہوا اور لو چلنے لگی آوازیں ایک ایک کر کے آئی بند ہوگئیں اور بس ایک آدھ ہی کبوتر دکھائی دیتا تھا۔ آسمان تانبے کی طرح تپنے لگا اور جیسے گرد و غبار چڑھتا گیا اُس کا رنگ ملگجا ہوتا گیا۔ دوپہر بھر چیلوں کا چلچلانا اور رٹیموں کی گھڑ گھڑاہٹ دل خراش معلوم ہوتی تھی۔ فضا میں تکلیف دہ ہمواری تھی اور ہر گوشہ میں سورج کی تیز روشنی پھیل گئی اور ہر چیز پر سستی اور نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ لوگ کمرے بند کر کر کے لیٹ گئے۔ کتے بھی تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لیے ٹھنڈے کونوں کھدروں میں چھپ گئے اور چڑیاں مہندی کی شاخوں میں دبک کے بیٹھ گئیں۔ صرف کبھی کبھی کوئی جنگلی کبوتر دالان کے پردوں یا کارنس سے اُڑتا اور بیٹھ کے غوں غوں کرنے لگتا جس سے کوفت اور یکسانیت کا احساس اور بھی بڑھ جاتا۔

سورج ڈھلنے پر بھی گرمی میں کوئی کمی نہ ہوئی اور روشنی اسی طرح آنکھوں میں چبھتی رہی۔ دراز وں میں اور گلی کوچوں میں ہوا شائیں شائیں چل رہی تھی اور ٹین والوں اور ملائی کی برف اور سودا بیچنے والوں کی آوازیں بے کیف معلوم ہوتی تھیں لیکن جب سورج اور بھی نیچا ہو کر زمین سے ملنے لگا تو لوگ ٹھنڈے ٹھکانوں سے باہر نکل آئے اور کام کاج میں مشغول ہو گئے۔

۴

تیسرے پہر اصغر گھر سے نکلا۔ گرمی ابھی تک کافی تھی اور لُو کے جھکّڑ بدستور چل رہے تھے۔ جب وہ محلّے میں پہنچا تو دوکان دار اپنی اپنی دوکانوں کے سامنے چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ سودے والے طرح طرح کی چیزیں بیچ رہے تھے، خربوزے اور تربوز، کھیرے اور ککڑیاں، شہتوت اور فالسے، اور فضا اُن کی آوازوں سے گونج رہی تھی۔ کالے کالے لگا دیتے ہیں شربت کو۔

اصغر پھلوں کے چھلکوں اور چھڑکاؤ کے پانی سے بچتا بچاتا جا رہا تھا۔ ایک گلی کے نکڑ پر کچھ لفنگے ایک پاگل عورت کو گھیرے ہوئے تھے وہ ننگی بُچ تھی اور اس کی ڈھلکی چھاتیاں تھنوں کی طرح لٹکی ہوئی تھیں جو چلنے میں جھکولے کھاتیں۔ اس کا چھوٹا سا گھٹا گھٹا ہوا سر اُس کے توانا جسم پر اخروٹ کی طرح رکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ جب لڑکے اسے گالیاں دیتے یا پتھر مارتے تو وہ لاچاری سے ایں ایں کر کے چلّاتی اور اس کے منہ سے رال بہنے لگتی۔ ایک سیانا لڑکا اُسے چھیڑ رہا تھا:

"اری بتا تو رات کہاں رہی؟"

بِگلی ایں ایں کر کے مٹکنے لگی اور اصغر کو آتا دیکھ اُس سے التجا کرنے لگی کہ میرا پیچھا چھڑاؤ۔ لیکن اصغر کتراتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ وہیں ایک چھوٹی سی اندھیری سی کوٹھری میں خلیفہ کی دوکان تھی اور یہ تماشا دیکھ کر اس نے قہقہہ لگایا۔ وہ اوباش قسم کا آدمی تھا اس کی سیاہ گھونگردار ڈاڑھی اور تیل میں بھیگی ہوئی لٹیں اور کاجل بھری آنکھیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ جونہی اصغر قریب آیا تو خلیفہ نے اسے بُوالہوسی سے دیکھا مگر اسی وقت مرزا دودھ والے نے لونڈوں کو للکارا:

"ابے حرامزدو! بیچاری عورت کو کیوں دِق کر رہے ہو؟ شرم نہیں آتی تم کو۔ جاؤ گھروں کو دفعان ہو یہاں سے؟"

اصغر سڑک پر لوگوں کے ہجوم میں مل گیا۔

سامنے ایک ضعیف العمر شخص خالی قمیص پیجامہ پہنے تُسری ٹوپی اوڑھے جا رہا تھا۔ اس کی عمر دہ آنکھوں میں ایک عجیب اضطرار جھلک رہا تھا، جیسے وہ کسی کھوئی ہوئی چیز یا بچھڑے ہوئے حبیب کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ اسے دیکھ کر اصغر کو بھوپال کے وہ دن یاد آ گئے جب اُسے نہ کسی سے محبت تھی اور نہ وہ عشق سے واقف تھا۔ مگر وہ زمانہ خواب ہو چکا تھا جب دنیا اس کے لطف و عنایت کی محتاج تھی اور وہ پھیلے ہوئے دامنوں کو بھرنے والا تھا۔ آج جب کہ وہ خود ناداروں کی طرح تہی دامن تھا اُسے معلوم ہوا کہ محبوب بننا کس قدر آسان ہے۔ جب اس کو یہ خبر نہ تھی کہ عشق کی راہ میں ایسے سخت مقام بھی آتے ہیں کہ مایوسی اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ نہ معلوم اس نے کتنوں کے دل توڑے ہوں گے۔ مگر اس نے دیدہ و دانستہ کسی کی حسرتوں کو کب مٹایا تھا؟ اگر خود کسی نے اس پر جان دی تو یہ اس کا اپنا قصور تھا۔ تاہم اُسے اپنے ان چاہنے والوں میں سے ایک کا خیال

آ گیا جس کی آنکھوں میں وہی اداسی رہا کرتی تھی جو آج اس ضعیف العمر شخص کی آنکھوں میں دکھائی دے رہی تھی۔ مگر اصغر نے کبھی اس کی حالتِ زار پر رحم نہ کھایا تھا، اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش کو بھی بے التفاتی سے ٹھکرا دیا تھا۔ عاجز ہو کر اصغر کی بے مہری پر اُس نے کہا تھا:

"اللہ کرے آپ بھی عاشق ہوں کسی پر"

یہ شاید اسی دل جلے کی بد دعا کا اثر تھا جو آج وہ اپنی حالت سے بے گانہ تھا۔

وہ نہ جانے کب تک پرانی یادوں میں گم رہتا۔ مگر بندو کا گھر آ گیا تھا۔ سامنے وہ قدیم اور شاندار پھاٹک تھا، جس کے دونوں طرف پتھر کی نشستیں بنی ہوئی تھیں جن پر بیٹھ کر بندو اور اصغر گپ شپ کیا کرتے تھے، اور اسی چار دیواری میں وہ مستانا زبھی جس کی خوشبو در و دیوار میں بس چکی تھی، جس کے دیدار کا طالب بن کر وہ بھکاریوں کی طرح دروازہ پر کھڑا تھا۔ اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ہچکچاتے ہوئے اس نے کنڈی کھٹکھٹائی۔

اندر سے ایک نازک آواز آئی:

"چنبیلی ذرا دیکھ تو دروازے پر کون دستک دے رہا ہے؟"

کیا یہ آواز ملبقیس کی تھی؟ اور اس خیال سے اس کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔ گلی میں ایک بچہ لکڑی کا گھوڑا بنائے خوش خوش بھاگتا چلا گیا اور گلی کے پرلے سرے سے ایک آدمی کی جادو بھری آواز سنائی دی:

"آنکھ کا کاجل صاف چرالیں چوریاں اس بلا کے ہیں"

لیکن پھیرا لگانے والا دور چلا گیا اور آواز کبوتر بازوں کی سیٹیوں اور ہاؤ ہو میں کھو گئی۔ چنبیلی نے کھڑکی میں سے منہ نکالا اور اصغر کو دیکھ کر مسکرائی۔ اصغر نے پوچھا:

"بندو ہیں؟"

"بندو میاں تو نہیں ہیں اور اشفاق میاں بھی ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔ لیکن اندر آ بیٹھئے نا۔ آپ کی بھابی جان ہیں۔"

لمحہ بھر وہ کشمکش و پیچ میں رہا، پھر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اندر چلا گیا۔ صحن کے بیچوں بیچ ایک حوض تھا اور اس کے ارد گرد موتیا اور گل شبو لگی ہوئی تھی۔ چھڑکاؤ ابھی ابھی ہوا تھا اور بازار کے مقابلے میں اندر ٹھنڈک تھی۔ اشفاق کی دلہن پلنگ پر بیٹھی ہوئی موتیا کا ہار پرو رہی تھیں۔ کانوں میں پھولوں بھری بالیوں نے ان کے بالوں کی سیاہی کو اور بھی سیاہ کر دیا تھا۔ اور ان کی کالی کالی آنکھیں پھولوں کے سفید ہالے میں چمک اٹھی تھیں۔ ان کا رنگ گندمی تھا اور حنا نے انگلیوں کی زینت اور بڑھا دی تھی۔

اصغر قریب جا کے بیٹھ گیا اور اشفاق کی دلہن نے چنبیلی سے شربت منگوایا۔ کمرے میں سے کسی نے پوچھا:

"اے میاں تمہارے ہاں سب خیریت ہے؟ مہرو کی تاریخ ٹھہر گئی یا نہیں؟"

"وہ گھڑی کب آئے گی جب تمہاری شادی کی خبر سنیں گے؟" اس کی بھاوج بولیں۔

یہ سن کر ایسا معلوم ہوا کہ اصغر کے دل کا چور پکڑا گیا اور اس کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ بات ٹالنے کے لیے وہ کڑھے ہوئے تکیہ کے غلاف کی تعریف کرنے لگا۔ دالان میں کسی چیز کے گرنے کا چھناکا ہوا۔ چڑیوں کا ایک جوڑا حوض کی منڈیر پر آ بیٹھا اور چوں چوں کرنے لگا اور ایک اڑتے ہوئے کبوتر کی بیٹ اصغر کے قریب ہی آ کر گری۔ اشفاق کی دلہن نے کہا:

"معلوم ہوتا ہے تمہیں پسند آیا۔ بلقیس کے ہاتھ کا کڑھا ہوا ہے۔"
اس نام کے سنتے ہی ایک بجلی سی کوند گئی اور دید کی تمنا نے دلِ مہجور کو اور بیتاب کر دیا۔ پیروں کی آہٹ سن کر اس نے کن انکھیوں سے دیکھا لیکن چنبیلی شربت لے کر آ رہی تھی۔ شربت سے بھی اس کا اضطراب کم نہ ہوا، اجازت لے کر وہ باہر نکل آیا۔

٭ ٭ ٭

ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور اس کی آنکھوں میں ریت گھس گئی۔ ایک بگولا اپنے ساتھ کاغذ کے پرزے کبوتروں کے پر اور گرد و غبار لیے چکر کھاتا ہوا چھتوں کے اوپر بلند ہوا اور زور ختم ہونے پر کوڑا کرکٹ ایک ایک کر کے زمین پر گرنے لگے۔ قریب ہی ایک بوسیدہ مکان سے دو عورتوں کی لڑنے کی آوازیں آئیں:

"مجھ جنم جلی کو رزق ہے نا موت! میں تو اس زندگی سے تنگ آ گئی۔"
اصغر نے باری کے مکان کا رخ کیا جو اسی محلّہ میں رہتا تھا۔ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے اور وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ زینہ میں کبوتروں کے پر اور خاک پڑی ہوئی تھی۔ مکڑیوں نے جگہ جگہ جالے تن رکھے تھے جن میں مکھیوں اور چیونٹوں کے ڈھانچے اٹکے ہوئے تھے۔ اصغر چھت پر پہنچا۔ باری اس وقت پتنگ اڑا رہا تھا اور ادھر ادھر پرانی پتنگیں الجھی ہوئی ڈور اور ٹوٹے ٹھڈّے پھیلے ہوئے تھے۔ باری نوعمر تھا۔ اس کا رنگ زردی مائل اور سر کے بال سن کی طرح بھورے تھے جو بالکل نقلی معلوم ہوتے تھے۔ پھول دار چکن کے کرتے میں پاندار زنجیروں والے بٹن تھے اور سینے پر بازو پر سیاہ غلاف میں تعویذ منڈھا ہوا تھا۔ اصغر کی آواز سن کر پتنگ سے نگاہ ہٹائے بغیر کہنے لگا:
"ارے یار بہت دنوں بعد دیدار ہوئے، کہاں تھے؟"

اصغر نے جواب دیا:

"زندگی دوبھر ہوئی مرنے کا ساماں ہو گیا
عرصۂ ہستی سمٹ کر تنگ زنداں ہو گیا"

باری نے چرخی پر ڈور لپیٹتے ہوئے کہا:

"اماں کیا شیریں فرہاد کی داستان سُن کے آئے ہو! یاروں کے سامنے ایسے شعر نہ پڑھا کرو۔ آخر ایسی کیا بپتا پڑی ہے؟"

آسمان پر پتنگوں کا اژدھام تھا۔ کالی، سفید، نیلی، پیلی، چپ، چرڑے، گنڈیریل، بھیڑیے، چاند تارا، نعلدار، منہ دار، گلاس دار، آنکھوں دار، شکر پارے، چوریریاں، مانگ دار، سب ہی طرح کی پتنگیں تھیں اور ان میں دم چلیں بھی تھیں اور دھیر چلیں بھی، پونے بھی اور آدھے بھی، نیچی پتنگیں بھی تھیں اور آسمان میں تارا بنی ہوئی بھی۔ کچھ ناچ رہی تھیں، کچھ ٹھمکی لگا رہی تھیں اور کچھ تنی کھڑی تھیں۔ کہیں کہیں پینچ ہو رہے تھے، کہیں پینچوں کی تیاریاں۔

باری ایک گنڈیریل اُڑا رہا تھا۔ پینچ ہوتے ہی اُس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں بھینچ کر زور زور سے ڈور کھینچنی شروع کی۔ پھر پتنگ کو ہوا کے دھارے پر لانے کے لیے ہلکے ہلکے ڈھیل دینے لگا۔ اُس کے مخالف نے زور سے اچیم کی اور باری کی گڈی کٹ گئی۔ آس پاس کی پتنگیں اُسے لپٹانے کی کوشش کرنے لگیں۔ دُور سے شور ہوا، "وہ کاٹا" اور برابر کے کوٹھے پر ایک لڑکا گانے لگا:

"دو مانجھوں میں کاٹی ٹھکّل تیری مکڈے جان"

باری ڈور کھینچنے لگا اور بولا:

"بُرے کٹے یار۔ اُڑاؤ گے؟"

یہ کہہ کر وہ ایک کونے میں گیا جہاں گڈریوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، لیکن سب ہی کہیں نہ کہیں سے نکلی ہوئی تھیں۔ دُور سے آوازیں اور زور سے آنے لگیں:

"پیری ہے بے لمڈے کی۔ پیری ہے"

اصغر نے جواب دیا:

"کچھ جی نہیں چاہ رہا" اور چھجے پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔

شام ہو رہی تھی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخی مغرب میں پھیل چکی تھی۔ ریلوں کا دھواں بل کھاتا ہوا اوپر اٹھ رہا تھا جس سے سرخی کے کنارے سیاہ ہو گئے تھے۔ کبوتروں کے غول چھتوں سے اُڑتے اور آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں کھو جاتے۔ دُور دُور جہاں نظر جاتی تھی مکان ہی مکان دکھائی دیتے تھے۔ کہیں کہیں نئی عمارتیں بن رہی تھیں اور ان کی پاڑیں اور مچان جُھٹ پٹے میں ... تے تھے۔ شمال میں نیچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ ایک سیاہ

ختم ہو چکی تھی اور ہوا کی سائیں سائیں اور بھی تیز معلوم ہونے لگی۔

نماز کے بعد اصغر چارپائی پر لیٹ گیا۔ افق پر شام کا ستارا پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا اور ایک دلکش سبز روشنی ہر طرف پھیل گئی تھی۔ باری بھی پلنگ پر بیٹھ گیا۔ اصغر نے پوچھا:

"کیا اس دنیا میں خوشیاں ناپید ہیں اور انسان کے لیے محض دکھ اور درد ہیں جن کا کوئی علاج نہیں؟"

باری نے کہا:

"یار جب سے آئے ہو مرثیہ خوانی کر رہے ہو۔ اماں کچھ کہو گے بھی، یا نئی نویلی کی طرح بسُورے ہی بہاتے رہو گے؟ آخر کون سا قہر نازل ہو گیا؟"

اصغر نے آہ بھری اور کہنے لگا:

"باری! کیا کہوں ایک عالم تہہ و بالا ہو گیا۔ مگر تم کو اس کی کیا خبر! یہ تقدیر کی چالیں ہیں اور ہم اس کے قیدی درد و تکلیف سے تڑپتے ہیں۔ مگر اس کی بندش سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ جوں جوں فرار ہونے کے لیے زور بازو لگاتے ہیں اس کی گرفت اور سخت ہو جاتی ہے۔ ہم زخمی اور مجبور ہیں اور حقیقتیں المناک..."

اصغر کے الفاظ میں کچھ ایسی رقت تھی کہ باری اس کا درد دل تاڑ گیا اور شوخی سے اس کے سینے پر ہاتھ مار کے کہنے لگا:

"تو کہو میری جان! ہو گئے تم بھی کسی زلف کے اسیر۔ صاحب کو بڑا غرّہ تھا دل نہ دینے پر۔ ابھی تو آہیں بھر رہے ہو پھر کپڑے پھاڑو گے۔ میں تو ڈر گیا تھا کہ معلوم نہیں کیا حشر ٹوٹا۔ یار مجھے بھی تو بتاؤ کس کے تیرِ نگاہ نے تمہیں گھائل کر دیا؟"

اصغر نے جواب میں یہ شعر پڑھا:

"شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ماسُبکسارانِ ساحل ہا"

"مبارک ہو، تو تم عاشقِ نو گرفتہ فرہادِ ثانی ہو گئے۔ تو بھی خوب یاد آیا — پرسوں میں ذرا چاوڑی تک چلا گیا تھا۔ وہ مشتری بائی تم کو بہت یاد کر رہی تھی۔ اُس نے سلام کہا ہے تمہیں۔"

"جہنّم میں جائے مشتری، تمہاری رگ پھڑک رہی ہے اور اپنی جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"ارے بھئی تو یار خاں تو جان و دل سے حاضر ہیں۔ سینہ کی جگہ خون گرا دیں گے۔ یہ غلام عالی جاہ کے ہر حکم کا منتظر ہے، بتاؤ تو وہ بُتِ طنّاز کون ہے؟"

اصغر کچھ تامل کے بعد بولا:

"اس کے سراپا کا کیا کہوں۔ وہ حسین ہے بے حد حسین، سرو قد، غنچہ دہن، سیمیں بدن، گلاب سے زیادہ نازک، اُس کے معطّر گیسو شبِ ہجر کی طرح دراز اور سیاہ ہیں۔ رخساروں کی تابش وصل کی گھڑیوں سے زیادہ تابدار ہے۔ دانت گوہرِ آب دار کی لڑی، لبِ لعلیں خونِ دلِ عاشق سے زیادہ سُرخ اور آنکھیں تیرِ و تفنگ سے آراستہ ہیں۔ ان کی وہ مستانہ گردشیں، اگرچہ پتلیاں سمِ قاتل تھیں تو سفیدی میں تریاق، جو چارہ گر بھی ہیں اور ستم گر بھی، ابروئے خم دار کی کمان اس پر غضب، پلکوں کے تیرِ نیم کش جلوۂ دید کے مشتاقوں کو بسمل بنا دیتے ہیں۔ کون ہے جو اس کافر کے حُسن کو بتا سکے؟"

"اُستاد! وہ عورت ہے یا کوئی غزل؟" باری نے بمشکل ہنسی ضبط کر کے کہا۔

اصغر چڑ گیا اور بولا:

"پھر تم ہنسی اُڑانے لگے؟" اور یہ مصرع دو ہرایا،

"تجھے، اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں"

"خیر صاحب! ہم نے مان لیا وہ پری نژاد ہیں، حور سہی۔ مگر نام کیا ہے اس بلا کا۔

اس نیلم پری کا حاصل کرنا آخر کون سا جان جوکھوں کا کام ہے، کیا کالے دیو سے پنجے بازی کراؤ گے؟"

"باری! مذاق چھوڑو، وہ نہ حور ہے، نہ پری، کاش ایسا ہوتا تو اُسے حاصل کرنا کتنا آسان تھا۔ قیامت تو یہی ہے کہ اُس تک رسائی مشکل ہے۔ مقدر ہی اپنا دشمن ہو گیا ہے۔"

باری اب زچ ہو چکا تھا۔ کہنے لگا:

"بتاتے ہو تو بتاؤ، ورنہ بکواس بند کرو۔"

اصغر نے باری کے کان میں چپکے سے کہا:

"بندو کی بہن بلقیس۔"

"واہ یار! میں تو سمجھا تھا کہ ایڈورڈ کی لونڈیا ہے۔ اتنی سی بات تھی اور افسانہ کر دیا۔ اماں یہ تو چٹکی بجاتے یوں ہو جائے گا۔"

"نہیں باری نہیں، یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ سوچو تو سہی مجھ میں کونسی شاخِ زعفران لگی ہوئی ہے جو کوئی اپنی بیٹی مجھے تھما دے گا۔"

"صاحب آپ نے عشق لڑانا تو شروع کر دیا مگر رہے بچّوں کی طرح بیوقوف اور عورتوں کی طرح بے عقل، ہمّتِ مرداں مددِ خدا۔ اپنا تو یہی اصول ہے پیارے اور مجھے معلوم ہے مرزا جی والے تم پر لٹّو ہیں۔ اجی بھلا لٹّو کیوں نہ ہوں، تم جیسا خاندانی حسین جوان کہاں ملے گا انھیں؟ میاں آنکھ بند کر کے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور سر پر بٹھائیں گے۔ ہے کچھ شرط؟ بھلا تمہاری جو خاطر داریاں کی جاتی ہیں، بلاوجہ تو نہیں ہیں۔"

باری کے یہ کہنے سے اصغر کو بھی چھوٹی چھوٹی سی باتیں یاد آنے لگیں۔ یہ حقیقت تھی کہ بندو کے گھر میں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی اور اس کی ماں اصغر پر

خاص طور پر مہربان تھیں، اور خاطر و مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتیں۔ اس کی تعریفیں کرتے ان کا مُنہ خشک ہوتا تھا۔ انھوں نے یہ کہہ کر اس سے پَردہ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ میاں تم سے اب کیا پردہ؟ میرے لیے جیسے بُندو ویسے تم۔ اور پھر وہ بلقیس کو انگریزی پڑھانے پر مصر ہونے لگیں مگر اشفاق نے اس بات کی مخالفت کی۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ دن اس کو یاد آگیا جب پہلی بار اس کا بلقیس سے آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ اُس دن وہ بندو کے ہاں انگنائی میں بیٹھا ہوا تھا بلقیس کو غالباً اس کے آنے کی بالکل خبر نہ تھی اور وہ بے دھڑک صحن میں آگئی اور جب اس کے عین سامنے پہنچی تو یکبارگی ان کی نگاہیں مل گئیں۔ اصغر کو دیکھتے ہی وہ بھونچکی ہو کر اُلٹے پاؤں بھاگ کر کمرے میں چھپ گئی۔ اصغر اس کے رُعبِ حُسن سے حیرت زدہ ہو کر بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

کبھی کبھی ایک چھوٹی سی جھلک مدّتوں کی مُلاقاتوں سے زیادہ گہری ہو کر قلب و نظر میں سما جاتی ہے اور اصغر کے لیے یہ لمحہ بھر کا جلوہ ایک عالم بن گیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ وقتی جذبہ ہے اور وہ اسے بھول جائے گا مگر ایسا نہ ہوا، اور جہاں بھی وہ جاتا بلقیس کا خیال سایہ کی طرح اس کے ساتھ رہتا۔ دن کے اُجالے میں اُس کے حُسن کی رعنائیاں ایک پُر فریب راز کی طرح اس کے دل میں چھپی رہتیں اور رات کی تنہائی میں جب وہ سونے لیٹتا تو ماہ و نجوم عشق و محبت کی داستانیں کہتے اور نشاط و شادمانی کے نغمے سُناتے، اور صبح جب وہ اُٹھتا تو وہی صورت نگاہوں میں بسی رہتی۔

لیکن وقت گزرتا گیا اور بلقیس سے ملنا ایک تمنا بن کے رہ گئی۔ محرومی بڑھتے بڑھتے آزارِ جاں ہو گئی اور اصغر کے دن شوریدہ سری اور راتیں خلش میں کٹتیں۔ آرام و سکون اُڑ گئے۔ نہ دوبارہ دید ہی میسّر آئی نہ ملاقات کا امکان ہوا۔ وصال

کی اُمید صرف شادی ہی پر منحصر تھی لیکن اُسے معلوم تھا کہ یہ بات بھی ناممکنات میں سے ہے۔ دونوں کے خاندانوں میں ایک خلیج حائل تھی۔ چونکہ مرزا شہباز بیگ نہ صرف مغل تھے بلکہ ان کا حسب نسب بھی درست نہ تھا بھلا میر نہال اس رشتے پر کیوں کر رضامند ہو سکتے تھے۔ آخر وہ اسی خاندان کے فرد تھے جو عربستان سے آیا تھا اور جس کو اپنے اصل نسل سیّد ہونے پر ناز اور عالی نسبی پر ہمیشہ فخر رہا، اور اس تناور درخت میں لچک پیدا کرنا پتھر میں جونک لگانے سے زیادہ مشکل تھا۔

اصغر اس منزل پر کھڑا تھا جہاں ایک طرف محبّت و اشتیاق کا بحرِ بے کنار اور دوسری طرف وہ قدیم قلعہ جس کی فصیلیں خاندانی عزّت و ناموس پر کھڑی تھیں جس طرح ان فصیلوں کو گرانا اُس کی قوت سے باہر تھا اسی طرح اس کی بیماریٔ عشق لاعلاج تھی۔ باری اس خاندانی اونچ نیچ کو سمجھتا تھا لیکن وہ اصغر کی طرح آسانی سے ہار ماننے والوں میں سے نہ تھا۔ چنانچہ اصغر کو پریشان دیکھ کر اس نے کہا:

"اگر کچھ پیسے خرچ کرو تو میں تمہارے ابّا کو قابو میں کرنے کے لیے سنہری مسجد کے پیر جی سے تعویذ اور فلیتے لا کر دوں۔"

اصغر نے کہا:

"اس وقت تو میرے پاس نہیں ہیں۔"

"ارے یار! کوئی ہزاروں لاکھوں تھوڑی چاہییں، بس کوئی بیس ایک روپے کافی ہوں گے۔ آخر تعویذ کا صدقہ دینے کو فقیروں کو کھلانا پڑے گا، پھر پیر جی کو بھی نذر دینی لازمی ہے۔"

اصغر تعویذ گنڈوں کا زیادہ قائل نہ تھا لیکن باری کے اصرار پر اُس نے جیب سے روپے نکال کر باری کے حوالے کر دیئے۔ باری نے کہا:

"کل ہی جاؤں گا۔ جادو کر دیں گے۔ گھبراؤ مت......"

عشاء کا وقت ہو چکا تھا اور اصغر گھر جانے کے لیے اٹھ گیا۔ گلیاں تنگ و تاریک تھیں صرف کہیں کہیں نکڑوں پر تیل کے لیمپ ٹمٹما رہے تھے۔ دور سے شہر کا شور ہوا کے ساتھ سنائی دیتا تھا، ایک پھول والا اصغر کے قریب سے آواز لگاتا ہوا گزرا۔ فضا تھوڑی دیر کو مہکی اور پھر وہی موریوں کی بدبو اور سڑاند کے بھبکے ناک میں گھسنے لگے۔ پاس ہی ایک ٹاٹ کے پردے کو جنبش ہوئی، اور کسی کا دستِ حنائی باہر آیا اور کھڑے ہوئے فقیر کے کاسہ میں روٹی ڈال دی اور فقیر دعائیں دینے لگا:

"خدا تیرے دل کی مرادیں پوری کرے بیٹی ملپنے خزانہ غیب سے تجھ کو دے..."

اصغر کشمکشِ خیال میں گھر پہنچا۔ اس کے دل کی خلش تو مٹی نہ تھی، مگر باری سے باتوں کے بعد اتنا ضرور ہوا تھا کہ اُس نے ایک بات کا فیصلہ کر لیا کہ حالات سے ہرگز مطیع نہ ہوگا۔ لیکن یہ مہم بغیر ہاتھ پیر مارے سر نہ ہوگی۔ اس کے لیے اوروں کی مدد درکار تھی۔

۵

وحیدہ بیگم اصغر کی سب سے بڑی بہن تھیں۔ کم سنی ہی میں ان کی شادی بھوپال میں سید وحید الحق سے ہوگئی تھی جو بالکل غیر تھے۔ ابھی دوسرا بچہ گود ہی میں تھا کہ عین عالمِ شباب میں ہاتھوں کی چوڑیاں ٹھنڈی ہو گئیں۔ حالانکہ اسلام نے نکاح ثانی کی اجازت دی ہے مگر انھوں نے اپنے اوپر رنگ و ریشم حرام کر لیا۔ اس کی وجہ غالباً یہی تھی کہ ہندوؤں کے ہاں بیوہ کی شادی مذہباً منع ہے اور ہندوستان میں رہنے بسنے والے مسلمانوں پر بھی اُن کے رسم و رواج کا اثر ہونا لازمی تھا۔

وہ فطرتاً نیک، دیندار سی تھیں۔ طبیعت میں سادگی اور قناعت ہمیشہ سے تھی۔ ان کا ایمان مضبوط اور انھیں خدا پر کچھ ایسا کامل یقین تھا کہ اس کے بھروسے ہر مشکل کو جھیل جاتی تھیں۔ آخر تو میر نہال کی بیٹی تھیں اور باپ کی طرح خود دار۔ سسرال والوں میں اپنا بھرم بھاری رکھنے کو میکے میں بھی آکر نہ بیٹھیں۔ کچھ تو ساس سسر کی خوشنودی منظور تھی اور کچھ لوگوں کی بہتان تراشی اور چہ میگوئیوں سے بھی ڈرتی تھیں

اور دنیا کو نام دھرنے کا موقع نہ دینا چاہتی تھیں۔ اگرچہ اُن کو اپنے عزیز و اقربا کی کمی اکثر محسوس ہوتی اور گھر کی یاد بھی ستاتی تھی، لیکن جب زیادہ جی بھر آتا تو کونے کھدرے میں منہ چھپا کر رو لیا کرتیں اور اس طرح گھر جانے کی خواہش وقتی طور پر دب جاتی۔

ایک بیٹی اور ایک بیٹا اب ان کی زندگی کا سہارا تھے۔ وہ ان کو چھپتر چھاؤں رکھتیں اور ان کی بہبودی اور آرام و آسایش کے سوا انھیں کوئی اور لگن نہ تھی۔ مشرقی مائیں اولاد پر اپنی دنیا تج دیتی ہیں اور اپنے ارمان و تمنائیں بسرا کر بھری جوانی صبر و شکر سے کاٹ دیتی ہیں۔

اصغر چونکہ بچپن میں ان سے بہت ہلا ہوا تھا اس لیے اپنی شادی کے بعد بھی وہ اس کو بھو پال لیتی گئی تھیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جہاں انھوں نے اصغر کو ایک ماں کی طرح پالا پوسا تھا وہاں اصغر کو بھی بیٹوں کی طرح بہن سے محبت تھی۔ یہ قاعدہ [illegible] وہ محبت کرتا ہے۔

تھے، حقے کی نے پر بٹھا رکھا تھا۔ اس کی عمر کوئی تیس برس کی ہو گی۔ گل مچھے تو صاف تھے مگر سیاہ مخروطی ڈاڑھی بڑے شوق سے رکھ چھوڑی تھی۔ آنکھوں میں گہرا گہرا کاجل گھلا ہوا تھا جو بہہ کر گلوں تک آ گیا تھا۔ گلے میں تعویذ بھی پڑا ہوا تھا۔ گھر کے کام دھندے سے فرصت پا کر اس کا یہی معمول تھا کہ اپنے ساتھ توتے کو بھی بنا سنوار کر جھکتے پر بٹھا لیتا اور ایک کش کھینچنے کے بعد میاں مٹھو کو نئے لفظ سکھاتا۔ ابھی دو چار ہی گھونٹ لیے تھے کہ میر نہال کو واپس آتا دیکھ کر جلدی سے اپنا حقہ کواڑ کی اوٹ میں کر دیا اور کھڑے ہو کر پوچھنے لگا:

"حضور! کیا چاہیے؛ کچھ رہ گیا؟"

"نہیں نہیں۔ وحیدہ بی بھوپال سے آ رہی ہیں۔ ابھی ان کا خط آیا ہے۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہ اندر چلے گئے اور خط بیوی کو دے دیا۔

بیگم نہال خوشی سے بیٹی کو پکارنے لگیں:

"ارے مہرو، بہت یاد کر رہی تھیں نا، لو تمہاری آپا آ رہی ہیں۔"

ان کے بیٹے تو سب سرکاری ملازم تھے۔ شہر در شہر تبادلے ہوتے رہتے۔ صرف عید بقرعید کو آ جاتے ورنہ اپنے بیوی بچوں کو والدین کے پاس دلّی بھیج دیا کرتے۔ چونکہ وحیدہ بیگم بچپن سے ہی الگ ہو گئی تھیں اور بھوپال دلّی سے خاصا دُور تھا، کبھی سال چھ مہینے میں مہمانوں کی طرح آتیں اور چلی جاتیں۔ یہی وجہ تھی کہ ماں باپ دونوں کو ان سے خاص محبت تھی۔ بیٹی کے آنے کا معلوم ہو کر بیگم نہال پر جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا، اور اصغر کی تو دلی مُراد بر آئی اور وہ بہن کے انتظار میں گھڑیاں گن گن کر کاٹنے لگا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

گھر کے بیل و نہار وہی تھے۔ میر نہال حسب معمول صبح کبوتر بازی کرتے

اپنی کاروباری مصروفیت کی وجہ سے جانے کی جلدی بھی ہوتی۔ لہٰذا اجوتے اچھال اچھال کر اور ٹین کی چادریں بجا بجا کر کبوتروں کو بھڑکاتے۔ یوں تو ان کی جائداد خاصی تھی۔ دو دکانیں اور کٹرے تھے۔ دلّی کے قریب کاشت کے بیگھے بھی تھے اور ان سب کی آمدنی سفید پوشی کے لیے کافی تھی۔ مگر میر نہال کا خاندان بھرا پُرا تھا۔ پوری نو اولادیں تھیں۔ ہمہ جبلتی جانوں کے ساتھ دنیا کے سینکڑوں بکھیڑے لگے رہتے ہیں۔ لشتم پشتم کہاں تک گزر ہوتی۔ زمانہ پہلے کی طرح ارزاں بھی نہ رہا تھا۔ بنگی بندھی آمدنی میں کیونکر سارے اخراجات پورے ہوتے۔ مجبور ہو کر میر نہال نے ایک بیل والے کے ہاں تجارت میں روپیہ لگا دیا تھا۔ اپنی زندگی کو انھوں نے کاروباری ضرورتوں اور چند دیرینہ شوقوں سے اس طرح ہم آہنگ کر لیا تھا کہ وہ ایک مقررہ رفتار سے گذر رہی تھی؛ جس میں آسودگی اور ہمواری بھی ،

رات کے کھانے کے بعد البتہ وہ گھر سے ذرا چہل قدمی کا کہہ کر چلے جاتے لیکن درحقیقت وہ اپنے پرانے دوست نواب پٹن کے ہاں وقت گذارتے یا بتن جان کے جب سے میر نہال نے بتن جان کو رکھ لیا تھا وہ گانے بجانے کا پیشہ چھوڑ کر چاوڑی سے دریبہ میں اٹھ آئی تھی، جہاں میر نہال نے اس کے لیے ایک مکان کرایہ پر لے دیا تھا۔ بتن جان ایک تو نوجوان تھی دوسرے اس کی چتون میں بھا بنت تھی، پھر اونچے طبقہ کی شائستہ طوائف۔ یہ طوائفیں نہ صرف فنِ موسیقی میں مہارت رکھتی تھیں بلکہ اُن کا ذوقِ شعر و سخن اور فہم ادب بھی ارفع و اعلیٰ ہوتا تھا جن کے ہاں کبھی شرفا اپنے بچوں کو تہذیب و شائستگی اور آدابِ محفل کی تربیت کے لیے بھیجتے تھے، اور جن کے پاس نواب و رؤسا ان کی نکھری ستھری باتوں سے تفریحِ طبع کے لیے جاتے تھے۔ بتن جان اپنے غمزہ و ناز سے ان کی دل بستگی میں مصروف رہتی اور میر صاحب تمام دن کی کوفت مٹانے کے بعد آدھی رات گئے گھر آکر سو جاتے۔

اُن کی غیر موجودگی میں عفور بھی گل چھرّے اُڑاتا۔ اس کی آنکھیں تاتاریوں کی طرح خون آشام تھیں اور مضبوط سینے پر کھردرے بال اتنے تھے کہ ان کی زیادتی سے سینہ کالا ہو گیا تھا، مگر کسرتی جسم میں ایک لبھاؤ تھا اور شاید اسی کشش کے سبب وہ ادنیٰ قسم کی کسبیوں میں ہر دلعزیز تھا۔ جب ان کے گاہک چلے جاتے تو وہ عفور کو بلا لیا کرتیں۔ ایسے موقعوں پر وہ خاص اہتمام سے بن ٹھن کر جاتا۔ اپنی سفید شیروانی پر خوب عطر ملتا، سر میں تیل اس قدر انڈیلتا کہ بہ کر کنپٹیوں اور پیشانی تک آجاتا۔ گھر کا پکا ہوا کھانا تو وہ کھانا جانتا ہی نہ تھا۔ رنگے لبوں کے ساتھ مرغن کھانے کی چاٹ پڑ گئی تھی بغیر تندوری پراٹھے کے وہ ٹکڑا نہ توڑتا۔ صبح ڈنڈ پیلنا، بیٹھکیاں لگاتا اور بادام کا حریرہ پیتا۔ بے فکری اور اچھی غذا نے اس کو طاقتور بنا دیا تھا اور وہ ہمیشہ چاق و چوبند رہتا۔ گھر کا کام

بڑی پھرتی اور انتہائی وفاداری سے کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے کرتوت جانتے ہوئے بھی میر نہال اس کے رات بے رات غائب ہونے پر زیادہ تنبیہہ نہ کرتے تھے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ویسے گھر کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ہندوستان میں عورت کی زندگی تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سی ہے، جو ہمیشہ پرسکون اور خاموش رہتا ہے اور جس میں کبھی کوئی لہر اٹھ کر ہلچل پیدا نہیں کرتی۔ اسی طرح زنانخانے کی فضا ساکن تھی اور زندگی یکسانیت سے بسر ہو رہی تھی۔ نہ کہیں آنا تھا نہ جانا۔ کبھی کبھار کوئی خالہ ممانی یا دور پرے کے رشتہ دار ملنے آجاتے یا پھر بہت ہوا تو خود تیج تہوار پر، یا شادی غمی یا چھٹی چھوچھک کی تقریب میں کسی کے ہاں چلی گئیں، ورنہ وہ تھیں اور گھر تھا اور گھر کی محدود چار دیواری۔ اس کی قدیم اونچی اونچی کرونڈوں اینٹوں سے چنی ہوئی دیواریں ان کی عصمتوں کی نگہبان تھیں، اور ان کی ہر اینٹ اس محصور جہان کی بسنے والیوں کی بڑی وفاداری سے پاسبانی کر رہی تھی۔ ان کی سانولی سلونی صورتیں نامحرموں سے بیگانہ اور جوانی غیر مردوں کی نگاہ تعاقب سے محفوظ تھی۔ یہ ہستیاں بے خوف و خطر اس طرح جی رہی تھیں جیسے لاجونتی کی نرم و نازک بیل کو تمازت آفتاب سے بچانے کے لیے شیشے کے گھر میں رکھ دیا جاتا ہے۔ زمانہ لاکھ کروٹیں بدلے، وقت سیکڑوں پلٹے کھائے، طوفان آئیں، بجلیاں گریں، آندھی ہو یا بھونچال، قحط پڑیں، دنیا مرے یا جیے، تغیرات کون و مکان ہوں یا انقلاب آسمان، گھروں کے اندر کوئی تلاطم بپا نہ ہوتا۔ گردش دوجہاں سے بےخبر نازک اور معصوم زندگیاں گزرتی رہتیں۔ ایک دن آتا دوسرا چلا جاتا۔ صبح ہوتی شام ہوتی۔ ماہ و سال صدیاں بن جاتے، مرد زندگی کی آزمائشوں سے

بر سرِ پیکار رہتے، مردانہ قوتیں تلخیٔ حیات کا مقابلہ کرتیں اور یہ عورتیں دُنیا کی آفتوں سے پناہ میں رہتیں۔ ان کا وقت گھر کے روزمرّہ کے کام کاج، سینے پرونے، کھانا پکانے اور کھلانے میں صرف ہوتا یا پھر خالی بیٹھے بیٹھے بیکار باتوں میں کٹ جاتا۔ بلاناغہ صبح کو جمال بیگم اور انجم زمانی نیچے آجاتیں۔ کبھی دُلہے کے لیے کریلے چھیلے جاتے کبھی رائتے کے لیے ککڑیاں کدو کش کی جاتیں، نہیں تو کسنے کھول کے کتّا کٹا چھالیہ کتری جاتی اور سروتوں کے ساتھ ساتھ زبانیں بھی قینچی کی طرح چلتی رہتیں۔ دنیا جہان کی وہ کونسی بات تھی جو بغیر کہے سنے رہ جاتی ———

شادی بیاہ کے ذکر سے لے کر مرنے جینے تک کے بیان ہوتے۔ ایک ہی آواز سے باتوں کا چرخہ چلتا رہتا۔ خاندان بھر کے دکھڑوں کے علاوہ آپس میں گلے شکوے ہوتے اور کبھی کبھی ذراسی بات بڑھتے بڑھتے اچھی خاصی لڑائی ٹھن جاتی۔ ہنسی خوشی کی باتیں ہوتے ہوتے آوازیں گرم ہوجاتیں، لب و لہجہ میں تلخی آجاتی، اور بعض اوقات جمال بیگم اپنی دیورانی بیگم نہال سے خواہ مخواہ اُلجھ پڑتیں یا پھر انجم زمانی اپنی نند جمال بیگم کی لعن طعن سے دِق آکر ترکی بہ ترکی جواب دیتیں۔ دلچین بھی اکثر ان گھریلو قصّوں میں شامل ہوجاتی۔

جمال بیگم کا چہرہ طباق سا تھا۔ پیشانی خوب چوڑی تھی اور ناک توتے کی چونچ کی طرح خمیدہ۔ جب وہ بے بات کی جنگ میں ہارنے لگتیں تو زور زور سے چیختیں اور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر اور گود پھیلا پھیلا کر کوستیں۔ اگر کبھی کوئی صلح صفائی کرانے کی کوشش کرتا تو بس بگڑ جاتیں اور نہ صرف کہنے والے کو لتاڑتیں، بلکہ خاندان بھر کو پُن کر رکھ دیتیں۔ جب کچھ اور کتا چھنی کو باقی نہ رہ جاتا تو اوپر چلی جاتیں۔

مہرو اور مسرور کی چشم چوٹ چلا کرتی۔ جب سے مہرو کی بات پکّی ہوئی تھی

مسرور کو بھی اُشتک مل گئی تھی اور ان دونوں کا جھگڑا معراج کے نام سے شروع ہوتا۔ حالانکہ اس لڑائی میں جیت ہمیشہ مہرو ہی کی ہوتی مگر مسرور بھی اس کو چڑانے سے باز نہیں آتا اور "معراج معراج" کی لمبی تان لگا کر بھاگتا اور مہرو بظاہر اس پر غصہ اتارنے لگتی۔ لیکن مشرق میں اگر حُسن قیدِ دیوار میں تھا، تو لطیف و نازک احساسات بھی پردۂ حجاب میں۔ کنواری لڑکیوں کی قدرتی خواہشات اُبھرتیں، جذبۂ نفسانی بیدار ہوتا پر وہ ان کو غیرت کے اچھوتے دامن میں چھپا لیتیں۔ جب مہرو اپنے منگیتر کا نام پر ملا سنتی تو نہ صرف وہ مسرت جو اس نام سے وابستہ ہو گئی تھی بلکہ وہ اُمنگیں بھی جو اس کے دل کے عمیق گوشوں میں پنہاں تھیں، جاگ جاتیں اور اس کے خوابیدہ جذبات برانگیختہ ہو جاتے۔ وہ خود ان بے نام مسرتوں کے مفہوم کو تو نہ سمجھتی تھی لیکن اُس کے جذبات کا توازن ڈانواڈول ہو جاتا، اور اس حیلے سے سارا جوش غریب مسرور پر غصہ کی صورت میں اُترتا۔ مسرور کا معراج کہہ کر چھیڑنا جہاں اس کی دلی خواہش تھی وہاں سماعت پر تھپیڑ بھی اور اسے یہ محسوس ہوتا کہ کسی نے گھنی اور تاریک ترائیوں میں اُگنے والی کھمبیوں کا پتہ لگا لیا ہے یا اُس مکڑی کو عُریاں کر دیا ہے جو اپنے جال میں چھپی بیٹھی تھی۔ اس نام کے ساتھ ہی ایک چھپاکا سا ہوتا جیسے کسی نے ساکت پانی میں کنکر پھینک کر اُس کا سکون برباد کر دیا ہو۔ سطحِ آب پر ایک کے بعد دوسری موج اُٹھتی، گرداب بنتے، تھوڑی دیر کو یورش ہوتی اور پھر وہی پہلا سا جمود اور ٹھہراؤ ہو جاتا۔ مہرو بگڑ بگڑ کر مسرور کے پیچھے بھاگتی اور اگر اتفاق سے کبھی ہاتھ آ جاتا تو "مارتی" کوٹتی۔ "یہ ہمارا گھر ہے" کہہ کر اس کے کچوکے دیتی اور اپنی برتری جماتی، مگر پھر سارے احساسات حباب کی طرح بیٹھ جاتے، اور زندگی خاموش پانی کی طرح ساکت ہو جاتی۔

مسرور بیٹھا بیٹھا کر اپنی یتیمی پر آنسو بہاتا اور کبھی اپنی بچی کو یاد کرتا جو اُسے

دِلّی اپنی سمدھن بیگم نہال کے پاس تعلیم و تربیت کی غرض سے چھوڑ گئی تھیں۔ یہ بیچاری خود بیوہ تھیں اور اپنی بیٹی داماد کے در پر پڑی تھیں، بھلا مسرور کا دُم چھلا کہاں باندھتیں۔ مجبوری کا نام صبر ہے اور وہ رو دھو کر خود ہی چپکا ہو جاتا۔

اس کی زندگی گھر سے اسکول تک محدود تھی۔ اکثر وہ مدرسہ سے تھکا ہارا آتا اور بچی کھچی دال روٹی یا ٹھنڈا ٹھنڈا سالن جو کچھ ہوتا ٹھنڈے دل سے کھا لیتا۔ گرمیوں کی دوپہروں میں اکثر اس کا بھی جی چاہتا کہ سو جائے مگر مہرو کا جہیز ابھی سے سِلنا شروع ہو گیا تھا جبکہ شادی کوسوں دور تھی، اور مئی کی جلتی دھوپ میں اس کو چیزیں لینے بھیجا جاتا۔ کپڑا لا لا کر دکھانے، پسند کروانے، گوٹہ کناری بدلوانے ہی میں سینکڑوں چک پھیریاں بازار کی ہو جاتیں......

ایک شمس تھے جو مزے سے دیر میں اُٹھتے، اطمینان سے ناشتہ کر کے دفتر چلے جاتے اور پانچ ساڑھے پانچ بجے واپس آتے۔ آنے کے بعد ان کا معمول تھا کہ منہ ہاتھ دھو کر تیار ہوئے، محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھی اور شام کو ہوا خوری کرنے کہیں نکل گئے یا اگر کوئی عزیز آ گیا تو اس سے باتوں میں بیٹھ گئے ادھر باتیں وہی اللہ والوں کی ہوا کرتیں۔ تصوف سے تو خیر سُنا وُ واجبی سا تھا، البتہ پیروں فقیروں کی "کراماتوں" کے بہت قائل تھے۔ جمعرات کی جمعرات تمام مزاروں پر بڑی عقیدت سے حاضری دینے جاتے۔ خصوصاً نظام الدین اولیاء کے بہت عقیدت مند تھے اور وہاں کی حاضری کسی جمعرات کو ناغہ نہ ہوتی۔ سیر سپاٹوں اور تفریح سے جو وقت بچتا وہ بیوی کے پہلو میں بیٹھ کر گزار دیتے......

دونوں وقت سقّہ آواز لگاتا: "پانی لے آؤں؟" اور جواب ملے بغیر منہ بھر اندھیرے ہی ڈال اندر آ جاتا۔ اس کی کمر مشک کے بوجھ سے جھکی رہتی۔ اس کے ہاتھوں کی جلد بارہ مہینے پانی میں بھیگنے سے موٹی اور سخت پڑ گئی تھی اور گھائیاں

پھٹ کر سفید سفید کھپرے جم گئے تھے۔ وہ مشک کا تسمہ کھولتا اور غلل غلل پانی مشکوں میں بھر دیتا......

گھر کی اونچی اونچی دیواریں باہر سے آنے والی ہر بلا اور ہر آفت کے سامنے سینہ سپر کیے اُسی عزم و استقلال سے کھڑی تھیں اور زندگی دنیا کے گزند و نبرد آزمائی سے بے پرواہ تھی۔ چڑیاں اسی طرح مہندی کی شاخوں پر روز جھولا جھولتیں، لٹکتے ہوئے کونڈوں میں دانا دُنکتیں، پانی پیتیں اور دالان کے ٹاٹ بیٹی کے پردوں میں وہ چوں چوں کا شور مچاتیں جو حشر تک ختم نہ ہوتا ہوا معلوم ہوتا۔ کھجور کے سربہ فلک درخت میں رنگ برنگ کی گڈیاں کٹ کٹ کر اٹک جاتیں، کوّے صبح سے شام تک کائیں کائیں کرتے اور چیلیں چلچلاتیں۔ ہوا پتوں کو چھیڑ کر اِدھر سے اُدھر بے قرار کرتی، جھکڑ چلتے، خاک برستی، اور رات کو بلیاں گرے پڑے ٹکڑوں پر تخت کے نیچے لڑتیں اور جب جنگ سے فراغت پاتیں تو چھتوں پر گربہ پائی سے چہل قدمی کرتیں۔ گلیوں میں نالیوں سے سڑاند گھوٹتی، فقیر اپنی اپنی صدائیں لگاتے خونچے والے طرح طرح کی چیزیں بیچتے اور زندگی ایک عالم بے خبری میں گزرتی رہتی۔

۶

آخر ایک دن وحیدہ بیگم جن کے سب منتظر تھے آ گئیں۔ اصغر انھیں لینے اسٹیشن گیا تھا اور جیسے ہی کہاروں نے آواز لگائی: "سواری اتروا لو" سب گھر والے ڈیوڑھی کی طرف دوڑے۔ ڈولی کا پردہ اُٹھا کر باہر قدم رکھا ہی تھا کہ ہر ایک نے بھینچ بھینچ کر گلے لگایا۔ بیٹی سے مل کر بیگم نہال کی آنکھیں مسرّت سے پُرنم ہو گئیں۔ نواسی اور نواسے کو بار بار کلیجے سے لگاتیں اور سر پہ ہاتھ پھیرتیں اور پھر بھی اُن کا جی نہیں بھرتا۔ اصغر نے سامان اتروا کر صحن میں سنگوا دیا۔ پھر سب باتوں میں اس قدر منہمک ہوئے کہ کہاروں کو کرایہ دینے کا ہوش بھی نہ رہا۔ انھوں نے چلّانا شروع کیا: "امّاں جی کرایہ بھجوا دو۔" بیگم نہال نے پٹاری کی گردی کے نیچے سے پیسے نکال کر دلچین کے ہاتھ بھجوا دیے۔ اس کا دل بھی باتوں میں پڑا ہوا تھا اور درمیان میں اٹھنا اُسے ناگوار گزرا مگر کہار چلّا رہے تھے اور وہ کرایہ دینے چلی گئی۔

خلافِ معمول میر نہال بھی خوش خوش دوپہر کو گھر آ گئے۔ جھلی والے کے سر پر رکھوا کر ایک بڑا سا تربوز بھی لائے کھانے سے پہلے سارے گھر نے اکٹھے ہو کر تربوز مزے لے لے کر کھایا جو بہت سُرخ اور میٹھا نکلا۔ دلہن نے بیج سمیٹ کر دھوئے اور صحن میں سوکھنے کو پھیلا دیئے۔

مسرور بھی خوش تھا اور شمس دفتر سے آ کے حسبِ عادت بیوی کے ساتھ کلھیا میں بند ہو کر نہ بیٹھے بلکہ وحیدہ بیگم اور گھر والوں سے گھل مل کر باتوں میں شامل ہو گئے۔ اُن کی دُلہن بھی آج اپنا کمرہ چھوڑ کر سب کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ دلہن میں اچانک چستی آ گئی تھی اور وہ دوڑ دوڑ کر کھانے کی سرٹیپٹر میں لگی ہوئی تھی۔ غفور نے وحیدہ بی کے استقبال میں نہ صرف خود ہی کو عطر میں غرق کر لیا تھا بلکہ توتے میاں کو بھی عطر میں نہلا دیا تھا اور اُس کے پَر چڑی مُڑی ہو کر جگہ جگہ سے لال لال کھال نظر آنے لگی تھی۔

وحیدہ بیگم کے آتے ہی گویا زندگی میں نئی نمود آ گئی تھی۔ ہر شخص خوش تھا، ہر چیز متحرک۔ وہ مضمحل ہمواری آج کہیں چلی گئی تھی۔ چڑیوں کی چُوں چُوں میں خوشی کے راگ سُنائی دینے تھے۔ کھجور کا درخت ہوا میں جھوم رہا تھا اور اُس کے پتّے خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔......

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

وحیدہ بیگم اصغر کو دیکھتے ہوئے بولیں:

"کیا بات ہے تم بہت دُبلے اور کمزور ہو گئے ہو۔" اور پھر ماں سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں: "اماں! اصغر کو کیا ہو گیا ہے۔ بالکل ہڈیوں کی مالا نظر آتا ہے۔"

اصغر تو کچھ نہ بولا، بیگم نہال نے جواب دیا:

"اے کمبخت گرمی نے سب کا اچار ڈال رکھا ہے نہ کھایا پچے نہ پیا انگ لگے۔

ویسے تو اللہ رکھے کوئی بات نہیں ہے۔"

گرمی کا سنتے ہی جمال بیگم اپنے کو اور تیزی سے پنکھا جھلنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کو خدا کے ظلم یاد آ گئے اور بولیں:

"عضب خدا کا گرمی کمبخت نگوڑی ہے، آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ اس میں تو موئے فرشتوں کے پر بھی بھڑ بھڑا ہو جائیں۔" اور پنکھے کی ڈنڈی سے پیٹھ پر سے کرتا اٹھا کر گرمی دانے دکھانے لگیں۔ "رات بھر انگاروں پر لوٹتی ہوں۔ نگوڑے گرمی دانوں نے پیٹھ کو پکا پھوڑا بنا دیا۔ توبہ ہے اللہ میاں کو رحم بھی نہیں آتا۔ مارے ڈالتے ہیں ..... اے بی انجم دیکھ کیا رہی ہو۔ ذرا ہوا کر دو۔" اور انجم نند کی پیٹھ کو پنکھا جھلنے لگیں اور پیٹھ کو کھجاتی بھی جاتیں۔ .....

رات کا کھانا سب نے ساتھ مل کر کھایا۔ جمال بیگم بھی اپنے ہاں کے پکتے ہوئے پسندے لے آئی تھیں۔ کھانے اور باتوں سے فراغت ہوتے ہوتے دس کا آدھا بھی بج گیا جب کہیں جا کر اصغر کو بہن سے بات کرنے کا موقع ملا اور وہ دونوں چھت پر آ گئے۔

بارہ وفات کا مہینہ تھا۔ شہر بھر میں قوالیاں ہو رہی تھیں۔ جگہ جگہ چوکیاں بیٹھی ہوئی تھیں اور ہر طرف سے ہارمونیم، تالیوں اور قوالوں کے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک قوال دھیرے دھیرے الاپتا اور دوسرا مصرع اٹھاتا، پھر سارے قوال ہمنوا ہو کر عشقیہ کلام گانے لگتے۔ کیفِ مجازی رنگ جماتا، کچھ کو حال آنے لگتا، قوال تکرار کرتے اور حال کھیلنے والا مدہوش ہو کر "حق اللہ" کے نعرے لگاتا۔ قوال مصرع دہراتے رہتے، اور آخر کار نعرے بند ہو جاتے۔ ایک کے بعد دوسری چوکی آتی اور آوازوں کا سلسلہ قایم رہتا۔

اصغر وحیدہ بیگم سے کہہ رہا تھا:

"آپا ایک وہ ہیں جن کے قدم سدا خوشیاں چومتی ہیں، اور ایک مجھ جیسے نامراد جو ذرا ذرا سی بات کو ترستے ہیں۔"

وحیدہ بیگم نے ٹھنڈا سانس بھر کے کہا:

"خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ مگر تو نج جو تم نامراد ہو۔"

"نہیں آپا میں ازل سے بدقسمتی اپنے ساتھ لایا ہوں۔ ہوش سنبھالا ہی تھا کہ آپ کو یاد ہوگا اماں کے دماغ میں فتور آگیا۔ تمام دن کوئلہ سے دیواروں پر شعر لکھا کرتی تھیں ——— یاد ہے نا؟"

"ہاں بڑے منحوس دن تھے وہ۔ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے مگر اُس وقت تو تم بالکل بچے تھے۔ اے تمہیں کیا یاد ہوگا۔ اماں کی بیماری تو اس وقت شروع ہوئی تھی جب دلہین کے ہاں بچہ ہوا تھا۔ مگر بدنصیب زیادہ جیا کہاں۔"

"ہاں ہاں مجھے سب معلوم ہے۔ آبا اور دلہین......" اصغر آگے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وحیدہ بیگم نے اُسے ٹوک دیا اور کہنے لگیں:

"مجھے بھی یاد ہے۔ ایک دن اماں دالان میں بیٹھی تھیں۔ ابا میاں نے انھیں منانے کے لیے کہا: "ذرا میرا حقّہ جلا دینا" ——— جس کا جواب انھوں نے تڑخ کر دیا تھا کہ "مجھے جلنا ہی آتا ہے جلانا نہیں" ——— ابا تو اپنا سا منہ لے کر رہ گئے مگر اس کے بعد سے تو اماں دیوانوں سے بدتر ہوگئیں۔ کبھی روتیں، کبھی ہنستیں اور کپڑے پھاڑ کر گلیوں میں بھاگتیں۔ جب کسی وید حکیم کی دوا سے آرام نہ ہوا تو اتفاق سے کمبل شاہ آ نکلے۔ انھوں نے کچھ تعویذ گھول کر پلوائے، دھونیاں دیں، اور پھر ہدایت کی کہ انھیں روشن چراغ دہلی لے جائیں اور وہاں مزار پر جھاڑ و دلوائیں۔ چچا بشیر کا مکان درگاہ میں تھا اور ابا

نے انھیں بلوا بھیجا۔۔۔ جس دن وہ اماں کو لے جانے والے تھے وہ تم کو گود میں لے کر بیٹھ گئیں اور مجھے چمٹا لیا اور بار بار کہتیں اپنے لالوں کو نہیں چھوڑوں گی ......"

"ہاں مجھے بھی یاد آ گیا۔ شام کا وقت تھا، ہم سب بہلی میں بیٹھ کر گئے تھے۔ آپ اور میں کیسے سہمے سکڑے کونے میں بیٹھے تھے۔ چچا بشیر کو خدا غریق رحمت کرے، ہماری گاڑی کے ساتھ ساتھ سارے راستے پیدل چلتے رہے۔ توبہ وہ گھر کیا تھا قبرستان تھا۔ چاروں طرف قبریں ہی قبریں تھیں۔ ہُو حق کا عالم، نہ کوسوں آدمی نہ آدم زاد نہ چڑیا کا بچّہ پر مارے اور کوٹھریاں ڈھنڈار اور ویران بھائیں بھائیں کرکے کھانے کو دوڑتی تھیں جن میں عقاب کی عقاب جمگاڈریں اِدھر اُدھر چکّر لگاتی تھیں اور ان کی غلاظت سے سارا گھر سڑ رہا تھا۔ چچا بشیر تو ہمیں وہاں پہنچا کر اپنے گھر چلے گئے اور اماں نیم کے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئیں .... جب وہ گھر یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم دونوں تنِ تنہا وہاں کیسے زندہ رہ گئے۔ اماں دن دن بھر ہم سے نیم کے تنکے چنوایا کرتی تھیں۔ اول تو دونوں فاقے کرتیں ورنہ سوکھے ٹکڑے پانی میں بھگوئے اور نگل لیے۔ دن بھر تڑاخے کی دھوپ پڑتی، لُو چلتی اور ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی پتوں سے کشتیاں لڑتی اور خاک تھی کہ کمرہ میں ڈھیریاں بنا دیتی۔ خشک پتے قبروں کے پتھروں پر عجیب بھیانک شور سے لوٹتے تھے اور سرِ شام ہی گیدڑ بھٹوں میں سے نکل کر روتے اور جنگلی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگتیں ......"

"چلو چھوڑو۔ جو گزر گیا سو گزر گیا"، وحیدہ بیگم نے موضوع بدلنے کو کہا: "وہ دن بھی تو یاد کرو جب اماں اچھی ہو گئیں اور ہم سب کو لینے ابا آئے تھے ہم کتنے خوش ہوئے تھے جیسے جنت مل گئی ہو ......"

ہوا کا ایک ہلکا اور خنک جھونکا آیا۔ قوالوں کی دوسری چوکی بیٹھ چکی تھی

اور وہ:

اذیت مصیبت ملامت بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

گا رہے تھے۔ اُن کی آواز ہوا کے جھونکے کے ساتھ آتی اور اسی جھونکے کے ساتھ واپس ہو کر فضا میں مل جاتی۔

"آپ کی شادی بھی تو اسی کے بعد ہوئی تھی"، اصغر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: "کتنے پیارے وہ دن تھے!"

"اے تم کو تو سب ہی کچھ یاد ہے"، اور وحیدہ بیگم نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ اپنے سہاگ کے دن ان کو یاد آ گئے اور ان کا چہرہ روشن ہو گیا۔

لیکن اصغر نے اُن کی دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا:

"ایک دن میں بس اسکول سے آیا تو گھر میں دیکھا ایک کہرام مچا ہوا ہے۔ دولہا بھائی کی اچانک اور نا وقت موت نے غیروں تک کو رُلا دیا تھا۔ ابّا اور اماں کی حالت تو دیکھی نہ جاتی تھی۔ پھر مجھے بار بار آپ کا خیال آتا اور ننھے ننھے معصوم بچّوں کا مگر شاباش ہے آپ نے بڑی بہادری سے مشکلات کا مقابلہ کیا۔ سب ہی آپ کی تعریف کرتے ہیں۔ آپ کے صبر کا اجر ضرور ملے گا۔"

وحیدہ بیگم ابھی تک ضبط کیے بیٹھی تھیں مگر اب اُن کی آنکھوں سے ٹپا ٹپ مُوٹے موٹے آنسو گرنے لگے۔ چمن لُٹ چکا تھا، اور بہاریں کھو گئی تھیں اور اصغر ویرانوں کے قصّے دوہرا رہا تھا۔

تھوڑی دیر وہ یوں ہی بیٹھی رہیں اور آنسو آنچل میں جذب کرتے ہوئے بولیں:

"تمہارے خط سے معلوم ہوتا تھا کہ تم پریشان ہو۔ بتاؤ تو کیا بات ہے؟"

"آپ کو تو معلوم ہے ابّا مجھ سے کچھ خوش نہیں ہیں۔ خفگی ترشی کے سوا کوئی

بات ہی نہیں کرتے۔ میری کالردار قمیص، پمپ جوتے، ہر چیز ان کو زہر لگتی ہے۔ یہاں تک کہ میرے ملنے جلنے پر بھی پابندی ہے۔ تمہاری بات تو پھر بھی سن لیتے ہیں، لیکن اِس پورے گھر میں میرا کوئی نہیں ہے اور نہ کسی کو مجھ سے محبت ہے نہ میری پرواہ" اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے ....

سامنے شیخ فضل الٰہی کارخانے دار کے ہاں قوّالی ہو رہی تھی۔ لوگ قطاروں میں گاؤ تکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ ہنڈوں کی روشنی میں ان کے چہرے واضح نظر آرہے تھے اور اُن کی پرچھائیاں میر نہال کے کوٹھے کی دیوار پر پڑ رہی تھیں۔ قوّال گلے پھاڑ پھاڑ کر گا رہے تھے اور فضل الٰہی کا بیٹا حمید حال کھیل رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے سینہ پر ہاتھ مارتا اور ہائے ہائے کرتا......

"آخر کچھ پتا بھی تو چلے وہ بات کیا ہے جس سے تم ہلکان ہو رہے ہو۔ ابا سے میں کہہ دوں گی۔"

اصغر نے کہا:

"میری زندگی کا فیصلہ ہونے والا ہے"۔

وحیدہ بیگم دل کھول کر ہنستے ہوئے بولیں:

"یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔ مبارک ہو۔ خدا وہ دن تو لائے کہ تم کو دولہا بنا دیکھوں۔ امّاں نے کہیں طے کر دی ہے؟"

"نہیں بھئی۔ معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ امّاں تو چاہتی ہیں اپنی بھتیجی یا مولوی نصیر الدین کی صاحبزادی کو میرے گلے باندھ دیں۔ مجھے تو اس کے نام سے وحشت ہوتی ہے"۔

وحیدہ بیگم کہنے لگیں:

"لو تم نے تو مجھے ہولا دیا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی"۔

"نہیں آپ سمجھی نہیں۔ میرا مطلب"

"تو تم سمجھا دو"

"میں تو کسی اور کو آپ کی بھاوج بنانا چاہتا ہوں"

"میں تو تم کو بڑا بھولا سمجھتی تھی"۔ وحیدہ بیگم نے جواب دیا۔ "تم تو چھپے رستم نکلے۔ اے ہمیں بھی تو بتاؤ وہ کون سی خوش نصیب لاڈو ہے"

"آپ بھی اس کا اتا پتا سن کر خلاف ہو جائیں گی"۔

"بتاؤ تو سہی"۔

"بھائی اشفاق کی سالی"

"لیکن تم کو اس سے اچھی لڑکیاں مل سکتی ہیں"

"دیکھیے آپا، میں نے جب کسی چیز کی خواہش کی اس کو کچل دیا گیا۔ میں علی گڑھ میں پڑھنا چاہتا تھا کہ والد محترم کو وہ فرنگی خانہ نظر آیا، جہاں مسلمانوں کو لا مذہب یا عیسائی بنایا جاتا ہے۔ خیر اب تو اس کا بھی قصہ ختم ہوا دل کی آرزو دل میں رہ گئی۔ اب شادی کے معاملے میں بھی میرے ساتھ یہی رویہ ہے۔ لیکن میں اِس بارے میں قطعی فیصلہ کر چکا ہوں۔۔۔۔"

قوال اس وقت نئی غزل گا رہے تھے:

دو چشمت کہ تیر بلا می زند
کجا می نماید کجا می زند

اور حمید زور زور سے نعرے لگا رہا تھا۔

"میں نے ہمیشہ آپ لوگوں کا کہا مان لیا"۔ اصغر نے کہا۔ "لیکن بلقیس سے شادی نہ ہوئی تو میں کچھ کھا کر سو رہوں گا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری"۔

"خیر تم اس قسم کے بُرے خیالات تو پاس نہ لاؤ ۔۔۔ جب تک میرے دم میں دم ہے تمہارے لیے جو بن پڑے گا کروں گی ۔ خدا تم کو رکھے"!

جو اصغر چاہتا تھا وہی ہوا اور خودکشی کے ڈراوے کا وار خالی نہ گیا ۔ وجیہو بیگم اس کی طبیعت کی ضد سے واقف تھیں، ڈر گئیں اور پکّا وعدہ کیا کہ اماں آبا کو رام کرلیں گی اور نیچے چلی گئیں ۔ حالِ دل سنا کر غبارِ خاطر کم ہوگیا تھا اور اصغر پلنگ پر لیٹ گیا۔

قوال ابھی تک "دو چشمت کہ تیر بلامی زند" بار بار دہرا رہے تھے اور حمید اسی طرح حال کھیل رہا تھا۔ ہائے ہائے کے نعرے زیادہ ہوگئے تھے اور اس کی بنتی بگڑتی ٹیڑھی میڑھی پرچھائیاں دیوار پر پڑ رہی تھیں اور رات کے اندھیرے میں شیطانی سایوں کی طرح ڈراؤنی معلوم ہوتی تھیں ۔ اصغر یہ چھائیاں دیکھتے دیکھتے اٹھا اور منڈیر پر کھڑے ہوکر فضل الٰہی کے گھر میں قوالی کا تماشا دیکھنے لگا ۔ قوال جو غزل گا رہے تھے اُس کے بھی حسبِ حال تھی اور وہ غمگین ہوگیا۔ لیکن جب اس کی نظر حمید پر پڑی تو وہ خود کو بھول کر حمید اور اس کی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

حمید تھا تو کارخانہ دار کا بیٹا مگر بڑا اسیدھا سادا، اور اس طبقے میں جو چالاکی اور تیزی ہوتی ہے اس میں بالکل نہ تھی ۔ اصغر اور وہ بچپن میں ایک ساتھ مولوی صاحب کے ہاں قرآن شریف پڑھنے جاتے تھے اور وہ نہ صرف پڑھنے میں اچھا تھا اور رکوع کے رکوع حفظ کر ڈالتا ۔ بلکہ مولوی صاحب کی جھاڑو بہارو اور حد ہے پتیلیاں مانجھنی بھی اپنے ذمہ لگالی تھیں اور ان کی ہر ضرورت کو اس تعلیم سے بجالانا گویا یہ بھی اس کا ایک تعلیمی فرض تھا۔ اس کے بعد شیخ فضل الٰہی نے اپنی دوکان پر کام سیکھنے بٹھا لیا اور اصغر سے اس کا ملنا جلنا تقریباً چھوٹ گیا۔

کاروخانہ داروں اور نچلے طبقہ میں لڑکا لڑکی کی شادی کچی عمروں ہی میں ہو جاتی ہے اور حمید ابھی اٹھارہ برس کا ہوا تھا کہ اُس کی شادی کے چرچے ہونے لگے۔ مگر پھر یہ سننے میں آیا کہ وہ اچانک پاگل ہو گیا ہے۔

پہلے ملا۔ یہ بیٹے کا یوں بیٹھے بٹھائے مخبوط الحواس ہو جانا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ جوان بیٹیا عمر کی آدھی کمائی ہوتا ہے۔ اس سانحہ کے بعد فضل الٰہی مارے مارے پھرے۔ جو کوئی جو کچھ بتاتا کرتے۔ مولوی مُلّا نیا نے، پنڈت کوئی نہ چھوڑا۔ تعویذ گنڈے عمل عملیات سب ہی کر ڈالے۔ درگاہ درگاہ بھٹکتے، مزار مزار پھرتے۔ منت نیاز صدقہ جو بن آئی۔ سب ہی کیا۔ مگر اس کا اُلٹا ہی اثر ہوتا تھا اور سارے ٹونے ٹوٹکے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ نہ معلوم وہ کیا ظالم جن تھا جو کسی منتر سے قابو میں نہ آیا۔ جب لاکھ جتن کر کے ہار گئے تو بڑے بوڑھوں کی رائے یہ ہوئی کہ حمید کو قوالی سنوائی جائے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔

حمید کو روز قوالی سنوائی جانے لگی۔ مگر بجائے اِس کے کہ اُس کو کچھ افاقہ ہوتا اُس کی دیوانگی اور بڑھ گئی۔ عشق و محبت میں ڈوبے ہوئے راگ اُس کے دل کی گہری ترین گہرائیوں کو چھیڑتے اور اس کے جذبات کو اور زیادہ مشتعل کرتے۔ عشقیہ نغمے تازیانوں کی طرح اس پر پڑتے اور ان کی تکلیف اس کے قلب و جگر کو ہلا دیتی۔ خون تیزی سے گردش کرتا ہوا جا جا کر دل کے پردوں سے ٹکراتا اور بھولی بسری چھپی ہوئی یادوں پر سے دھندلے نقاب اٹھ جاتے۔ ایسی ساعتوں میں اس کا دردِ دل بڑھتے بڑھتے روحانی کرب بن جاتا اور جسم و جان سے احساس درد مٹ جاتا اور وہ ایسا بے قابو ہوتا کہ کسی چیز پہ قابو نہ رہتا اور وہ بھڑک بھڑک اٹھتا اور پوری قوت سے اپنے سر کو در و دیوار سے ٹکراتا، ہاتھ پیروں کو پٹختا اور پچھاڑیں کھاتا۔ عشقیہ غزلیں جس قدر پُرشوق اور ولولہ انگیز ہوتیں

اسی شدت سے اُس کی تڑپ زیادہ اور ہائے ہائے کے نعرے بڑھ جاتے۔ ملّا سیانے یہی کہتے کہ جنّات بس اب کرب کی حالت میں ہے اب گیا اور جب گیا۔ پَر ان کو خبر نہ تھی کہ صدائے ساز اور نوائے مطرب سے حمید کے دل پر کیا گزرتی ہے۔

قوّال اس وقت ایک نعتیہ چیز گا رہے تھے اور اصغر بڑی عقیدت سے گردن جھکائے خاموش بیٹھا سن رہا تھا۔ دھیرے دھیرے موسیقی اس پر اثر کرنے لگی۔ روح کی گہرائیوں میں راگ اترتے چلے جا رہے تھے اور عشق و محبت دل میں سما گئے اور وہ حمید کو ہذیانی درد وایذا میں دیکھتا رہا اور نہ معلوم کہاں سے بدھو، درگی چماری کی لڑکی حمید کے ساتھ ساتھ اصغر کی نگاہوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس نے حمید کو اکثر بدھو چماری کے پاس گلی میں کھڑے ہوئے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ لڑکی قبول صورت تھی اور بڑی چٹاخ پٹاخ۔ اس کے انداز غیر معمولی طور سے دلربا تھے۔ اپنی میلی کچیلی کوٹھری کے سامنے جس میں دن کی دھوپ اور روشنی بمشکل آتی ہو گی بیٹھی ہوئی بالکل اُبلا پیری نظر آتی تھی اور اس کو دیکھ کر کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ نیچ ذات ہے۔ اس کے سُرخ اور زرد رنگ کے لہنگے اور شوخ نیلی اور دھانی چندریاں اس پر خوب کھلتی تھیں۔ رستہ چلنے والے بغیر نگاہِ غلط انداز ڈالے ہوئے اس کے پاس سے نہ گزر سکتے تھے۔ وہ اپنے قریب سے گزرنے والوں کو بے پروائی سے دیکھتی، اِٹھلاتی، عیارانہ ہنسی ہنستی اور نگاہوں سے دور تک ان کا تعاقب کرتی۔

اسے بکریاں پالنے کا بھی شوق تھا اور اس کی کوٹھری کے قریب سے گزرتے وقت موریوں کے تعفن کے ساتھ ساتھ بکروں کی بدبو آتی جو ہوا کو کثیف کر دیتی۔ یا تو وہ برتن بھانڈے راکھ سے مانجھ مانجھ کر چمکایا کرتی یا پھر

موری پر چارپائی بچھائے بیٹھی رہتی اور ایک فربہ بکری پائے سے بندھی ہوتی۔ جب کبھی اصغر ادھر سے گزرتا تو وہ بکری کو گلے لگا لگا کر چٹا چٹ پیار کرنا شروع کر دیتی اور ہنس ارتنا سے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھی جاتی" جن میں ترغیب ہوتی تھی۔ اُس کے انداز البیلے ضرور تھے لیکن حُسنِ صورت اور پُر فریبی کے باوجود اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی کیفیت تھی جن سے خواہ مخواہ نفرت ہوتی" اور اس کے طور طریق میں نہ کرا ہیبت تھی جس سے گھن آتی تھی۔ اس کی ماں دُرگی بھی دلّی کی اور چماریوں کی طرح خوبصورت تھی مگر بدھو ایک دفعہ دیکھنے کے بعد دوبارہ اچھی نہ معلوم ہوتی" تھی۔ اسے دیکھ کر نہ معلوم کیوں رات کی سیاہ کاریوں کا احساس ہوتا تھا، ایسے مکان کا جو بغیر بسے ہی غیر آباد ہو گیا ہو۔ چہرے کی خوبصورتی بھی اس کی روح کے بنجر پن اور ویرانی کی پردہ پوشی نہ کر سکتی تھی۔

ایک دن جب اصغر ادھر سے گزر رہا تھا تو وہ تین لونڈوں کے گھیرے میں کھڑی ہوئی تھی۔ ایک تو بڑا تھا اور دو اس سے ذرا چھوٹے اور تینوں مل کر اس سے شرطیں لگا رہے تھے۔ بڑے لڑکے نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا:

" اچھا دیکھ یہ لمڈا تیرے جہاں چاہے گھونسا مارے اور اگر تو نے گھونسا کھا لیا تو میں تجھے دو پیسے دوں گا۔"

لڑکے نے اپنی آستینیں اوپر چڑھائیں اور مُکّا دکھانے لگا۔ بدّھو" اوئی میّا" کر کے پیچھے ہٹی اور اپنی چھاتیوں پر ہاتھ رکھ کے نخرے سے بولی:

" بس ایک شرط ہے" ، اور اُس نے اپنی چھاتیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا: " یہاں نہیں۔"

بڑا لڑکا بولا:

" نہیں اس کی نہیں بدی تھی۔ یہ جہاں چاہے گا مارے گا: تو اپنے قول

سے نہیں پلٹ سکتی ....."

اس کے بعد کیا ہوا، بدھو جیتی یا وہ لڑکے، معلوم نہیں، کیونکہ اسی وقت اصغر کے چچا دوسری گلی سے آتے دکھائی دیے، اور وہ مڑ گیا۔

اِن سب واقعات کو سوچنے کے بعد اصغر کو حمید پر بہت ہی ترس آیا۔ حمید بذاتِ خود شریف اور دبا دبا رہتا، اور اس طرّار لڑکی سے مقابلہ میں کوئی تعجب نہیں کہ وہ دیوانہ ہو گیا۔ حمید کی بربادیوں نے اس کو اپنے غم یاد دلا دیے۔ کیا میرا بھی یہی انجام ہونا ہے؟ اس کے دل میں خیال آیا اور وہ کھڑا کھڑا یہی سوچتا رہا۔ حمید ابھی تک پتھنیاں کھا رہا تھا۔ اس کی پرچھائیاں دیواروں پر بن بن کر بگڑ رہی تھیں اور بگڑ بگڑ کر بن رہی تھیں۔ ستارے راز داری سے آنکھیں جھپک جھپک کر دیکھ رہے تھے۔ ہوا سرسرانے لگی اور قوال ایک نئی غزل گا رہے تھے:

دلکش گر مہرباں بودے چہ بودے
تو اے ناتواں بودے چہ بودے
لبِ لعلِ تو آبِ زندگانی
بہ کامِ عاشقاں بودے چہ بودے

مگر اس میں دردِ فرقت و انتظار اور ہجر و وصال وہی تھا۔ تانیں ابھرتیں، راگ لہریں لیتے اور قلزمِ شب کی ظلمت میں ڈوب جاتے۔ کہیں دور کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آتی یا کوئی انجن نغموں سے بے خود ہو کر سیٹی دیتا۔ چڑیلیں بلیاں چھت پر دھم سے کودتیں اور کوئی نیند میں غافل کبوتر پر پھڑپھڑاتا ہوا گھونسلے سے ڈر کے اڑ جاتا اور سہارے کی تلاش میں دیواروں سے ٹکراتا ہوا بے جگہ گر پڑتا.... گھنٹہ گھر نے ٹن ٹن دو بجائے اور اصغر پلنگ پر لیٹ گیا۔

۷

سویرے سے وحیدہ بیگم بیٹھی ہوئی اپنی اماں سے باتیں کر رہی تھیں۔ زانو پر آب رواں کا دوپٹہ پھیلا ہوا تھا جس پر توئی لگا کر شپاشپ ٹھپّا ٹانک رہی تھیں۔ بیگم نہال بڑے سے پاندان سے چھالیہ کے واسطے تریّاں چھیل چھیل کر چھوٹے قتلے کر رہی تھیں۔ دوپٹہ پر ٹھپّا ٹانکتے ٹانکتے وحیدہ بیگم ذرا تھمیں اور اماں کی طرف دیکھ کر بولیں:

"معلوم ہے اماں اصغر اللہ رکھے عید کے چاند تئیسواں بھرے گا۔"

"ہاں بی" بیگم نہال نے جواب دیا "مجھے تو اب اس کا گھر بسانے کی فکر کھائے جاتی ہے۔ تمہارے ابا کو تو کوئی فکر ہے نہیں کئی بار اس کے رشتے کے بارے میں کہہ چکی ہوں۔"

"تو پھر ابا کیا کہتے ہیں آخر؟"

"ایک دن میں نے ان سے ذکر چھیڑا تھا۔ وہ جواب دینے ہی والے تھے کہ موا سانپ نکل آیا اور بات آئی گئی ہوئی۔"

"کیا تم نے کوئی لڑکی ڈھونڈھ لی ہے؟" وحیدہ بیگم نے پوچھا۔

"لو، ڈھونڈھنے کا کیا سوال، اصغر کی مونچھوں کے کونڈے بھی نہیں ہوئے تھے جب ہی سے میری نظر میں ایک لڑکی ہے۔"

"تو یہ کہو۔ ہمیں تو اس کی بھنک بھی نہیں دی۔ کُنبے کی ہے یا غیروں میں ؟"
بیگم نہال فخریہ بولیں : "اے غیروں کی کیوں ہوتی۔ بھائی نصیرالدین کی چھوٹی لڑکی ثریا ہے۔ ایمان کی بات تو یہ ہے ثریا کے آگے مجھے کوئی لڑکی نہیں جچی۔ اس کے سامنے سب پانی بھرتی ہیں۔"

حمیدہ بیگم نے یہ سن کر ذرا تامّل کیا اور پھر ماں سے بولیں :

"اماں یوں تو لڑکی نک سک سے درست ہے پر اصغر کے جوڑ کی نہیں ہے۔"

بیٹی کے جملے پر بیگم نہال چونک پڑیں۔ اپنے انتخاب پر اعتراض کی توقع انھیں بیٹی سے نہ تھی اور وہ بولیں :

"کیوں بھئی آخر جوڑ کیوں نہیں ہے ؟ ذرا میں بھی سنوں ، ڈھنگ ، سلیقہ ، سگھڑاپا ، اور کیا چاہیے ؟ ایسی لڑکی کسے نصیب ہوتی ہے ؟ اصغر خوش رہے گا۔"

ترنوں کے قتلے ہو چکے تھے۔ انھوں نے دلہین کو پکارا :

"اری دلہین، ترکاری بن گئی۔ لے جا۔" پھر بیٹی سے مخاطب ہوئیں۔ "میں تو چاہتی ہوں اس نیک کام میں اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر پیام بھیج دیتی ہوں۔ آج تمہارے ابا سے بھی پوچھ لوں گی۔"

وحیدہ بیگم چپ چاپ ماں کی باتیں سنتی رہیں۔ طرح طرح کے خیالات ان کے ذہن میں آ رہے تھے۔ کبھی اصغر کی پسند کا کبھی اماں کی خفگی کا۔ آخر کار وہ کہنے لگیں۔

"بھئی اماں لڑکی کہیں بھاگی تو جاتی نہیں۔ ابھی اصغر کی عمر ہی کیا ہے۔ اس معاملہ میں جلد بازی اچھی نہیں۔ اور پھر مجھے تو شبہ ہے کہ اصغر کو وہ خوش نہیں رکھ سکے گی۔"

بیگم نہال کو اتنا سننا تھا کہ تلووں لگی سر کو جا کر بجھی۔ جھنجھلا کر بولیں :

"لو ! اور سنو۔ تم بھی جب بولوگی اپنے باوا کی طرح اُلٹی ہی کہوگی۔ آخر

خوش کیوں نہ ہوگا اس سے؟ تم لوگوں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ہر ایک میں مین میخ نکالا کرتے ہو۔ آپا کو معراج نہیں پسند، بہن کو ثریا۔ کوئی بھاوے ہی نہیں آتا۔ بھلا مجھے بھی تو بتاؤ ثریا میں آخر کونسا عیب ہے؟ لنگڑی ہے، لولی ہے، کانی ہے؟ اب سُرخاب کے پر تو لگنے سے رہے۔ ہاں سو عیبوں کا عیب یہ ہے کہ میری بھتیجی ہے۔ اور تم لوگوں کو میرے میکے والوں سے اللّٰہی بَیر ہے۔"

وحیدہ بیگم مناتے ہوئے بولیں:

"اماں تم تو ناحق خفا ہوگئیں۔ اللّٰہ جانتا ہے میرا مطلب یہ نہیں ہے وہ لاکھ اچھی سہی مگر کوئی خاص بات بھی تو نہیں ہے۔ بس آدمی کا بچہ ہے۔"

بیگم نہال نے تڑاتوڑ جواب دیا:

"تو تمہارے بھائی کے کونسے لال جڑے ہوئے ہیں۔ جیسے کوہ قاف کی پری ہی تو لائے گا؟"

"اصغر میں لال جڑے ہوں یا نہ ہوں مگر ہزاروں میں ایک ہے۔ اور پھر اس کی خوشی اور ناخوشی کا بھی سوال ہے۔ اب زمانے کی ہوا پلٹ گئی ہے۔"

بیگم نہال نے ناگواری سے جواب دیا:

"آخر تمہارے بڑے بھائیوں کی جو بیویاں اپنی پسند سے لائی ہوں تو کیا ان کی خوشی ناخوشی نہ تھی، مگر دیکھ لو آج تک مجھ سے تو کسی نے کبھی کوئی شکایت نہ کی، بلکہ میں تو یہ دیکھتی ہوں کہ جُورووں پہ دموں دیوانے ہیں۔ تیسوں دن کی نازبرداریاں اور بیسوں گھڑی کے چاؤ چونچلے۔ بالکل بن داموں کے غلام ہو کر رہ گئے ہیں۔"

وحیدہ بیگم نے دوپٹہ سمیٹ کر الگ رکھ دیا اور ماں کو دیکھنے لگیں۔ بیگم نہال کی پیشانی کے نینوں بل غصّے سے زیادہ ابھر آئے تھے۔ پھر لجاجت سے ماں سے کہا:

"اے بی امّاں برا نہ مانو مجھے تو یہ رشتہ بے جوڑ سا لگتا ہے۔ کہاں ہمارا اصغر
نکلتا ہوا قد، کھڑا کھڑا ناک نقشہ، پڑھا لکھا اور کہاں ثریّا پھیکا شلجم، بالشت بھر
کا ٹھنا قد بھدی بے ڈول، آواز سنو تو بے سُری اور اس پر اُن کا چڑچڑا پن۔ کریلا
اور اوپر سے نیم چڑھا۔ اصغر کے تو پاسنگ بھی نہیں۔ میں منع نہیں کرتی۔ تم بہو بنالاؤ۔
مگر یہ جوڑ ایسا ہی ہوگا جیسے کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند۔"

بیگم نہال نے پٹاری کا ڈھکنا زور سے بند کیا اور بولیں:

"لے بیٹی تم کو آج ہو کیا گیا ہے جو اوندھی اوندھی باتیں کر رہی ہو۔" اور
کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "توبہ ہے میری اس گھر میں جس سے بات کرو اُلٹی ہی سُنو۔
دُور کیوں جاؤ اپنے آغا بھائی کی دُلہن ہی کو دیکھ لو۔ کون سی باون گز کی ہیں۔ بٹوا سی
ہیں۔ ماشاء اللہ جیتے جاگتے آٹھ بچے تو جن چکیں پھر بھی کاٹھی جیسے کوارپنے میں تھی
ویسی کی ویسی

بیگم نہال جھنجھلاتے ہوئے بولیں:

"بیٹی تم نئی روشنی کی ہو جو چاہو سو کہو۔ ہمارے بڑے بڑوں سے تو یہی ہوتی آئی ہے جو لڑکی اماں باوا نے پسند کی، لڑکوں نے آنکھ بند کر کے حامی بھر لی۔ پسند نا پسند کا جو تم وظیفہ پڑھ رہی ہو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، کئے آمدی کے پیر شدی۔ برا بھلا پرکھنے والے ہم، اور تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں کمیتا نہیں بیرن ہوں۔ اس کی مرضی کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

وحیدہ بیگم نے جواب میں کہا:

"بہرحال تم کو اس کی مرضی کا ہر حالت میں خیال رکھنا چاہیے۔ فرض کرو تمہاری لائی ہوئی بیوی اس کو پسند نہ آئی تو پھر کیا ہوگا۔ ادھر اصغر کی زندگی وبال ادھر وہ سر پہ ہاتھ دھر کر کرموں کو روئے گی......"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ڈیوڑھی میں کسی نے پکارا "میں آ جاؤں"، اور ماں بیٹیوں کی بحث وہیں ختم ہو گئی۔

"کون ہے؟" بیگم نہال نے پوچھا۔

"میں ہوں سعید حسن!"

"میاں آؤ۔"

سعید حسن اندر آ گئے۔ پکی عمر، درمیانہ قد، داڑھی بھی کھچڑی ہو چلی تھی، چوگوشیہ ٹوپی اوڑھے ہوئے تھے۔ یہ میر نہال کے داماد تھے مگر دو سال ہوئے ان کی بیوی پہلے جاپے میں مر چکی تھیں اور جب سے ابھی تک رنڈوے ہی تھے۔ سعید حسن بڑے بذلہ سنج اور ہنسنے ہنسانے والوں میں سے تھے۔ طبیعت شگفتہ پائی تھی۔ ہزاروں لطیفے ازبر تھے۔ بڑی سعادت مندی سے ساس کو آداب کیا اور آ کر کمرے میں چاندنی پر بیٹھ گئے۔

وحیدہ بیگم نے بہنوئی سے سوال کیا:

"اے دولہا بھائی ذرا آپ ہی بتایئے آج کل مرد عام طور پر کس قسم کی بیویاں پسند کرتے ہیں۔"

سعید حسن نے مسکرا کر ساس کو دیکھا اور بولے:

"سن رہی ہیں آپ؟ سالی صاحبہ کیا پوچھ رہی ہیں؟ کیا مجھے دولہا بنائیں گی؟ کسی لڑکی نے مٹھائی کھلا دی ہے جو مردوں کی پسند اور ناپسند پوچھی جا رہی ہے۔"

بیگم نہال خاصی جلی بیٹھی تھیں کہنے لگیں:

"نہیں میاں اپنے لاڈلے بھیّا کی فکر ہے۔ عرش سے حور لائیں گی۔"

"پھر بتایئے نا دولہا بھائی؟" وحیدہ بیگم نے اصرار سے پوچھا کیسی بیوی ہونی چاہیے سعید حسن ڈاڑھی میں خلال کرتے ہوئے ذرا لطف لے کر بولے:

"بھئی مرد خود ہی سیدھا کہاں ہے۔ اس کی پسند کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ ٹیڑھا ہے۔ اگر مرد کا دل گدھی پر آجائے تو پری کیا چیز ہے۔ اور عورت وہی اچھی جس کو پیا چاہے اور سہاگن کہلائے۔"

پھر ہنس کر بولے:

"لیکن بزرگوں نے کہا ہے اور کتابوں میں پڑھا ہے اور رشی منی کا قول ہے، ایسی عورت کو بیوی بناؤ جو پدمنی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو پستہ قد ہو نہ سرا پنجے کا بانس نہ موٹی پھپھس نہ اچھور کی پھانک، نہ بدشکل ہو نہ پری زاد......

اب ذرا نکتہ سنو۔ اگر پستہ قد ہوئی تو بچوں کی وہ ریل پیل کر دے گی کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ لمبے قد کی ایک دو جھول کے بعد ہی کمان ہو جائے گی۔ اگر موٹی ہو گی تو سہرے سے گود ہری نہ ہو گی۔ بدشکل سے ظاہر ہے میاں رات کو ڈر کر چیخے گا کہ چڑیل آ گئی اور اگر پری رو زوجہ ہوئی تو تین سو پینسٹھ دن کا خطرہ اور

چاند سلامت رہ جائے تو معجزہ ......"

ان کے جواب میں دونوں ماں بیٹیاں ہنسنے لگیں اور بیگم نہال نے کہا:

"تم اپنی باتوں سے اب بھی باز نہ آؤ گے۔"

"تو ممانی جان میں نے جو کچھ کہا کیا اس میں کوئی جھوٹ ہے؟ حقیقت تو یہ ہے حد سے بڑھی ہوئی تو ہر چیز جان کا روگ ہوتی ہے۔ بس تھوڑی سی خوبیاں ہوں، محبت کرنے والی اور اطاعت شعار لڑکی ہو تو میاں بھی لٹو اور سسرال والے بھی واری صدقے۔"

یہ ان کی عادت تھی کہ جب بولنے پر آتے یکساں بولے چلے جاتے اور متعلق اور غیر متعلق چٹکلے سناتے رہتے۔ شادی بیاہ اور لڑکیوں کے ذکراذکار میں ان کو خاص لطف آتا تھا۔ شادی ان کے دل کی پوشیدہ تمنا بھی تھی۔ اپنی پہلی بیوی کو بیحد چاہتے تھے پر وہ نیک بخت کوئی بچہ بھی بطور یادگار نہ چھوڑ گئی۔ اب دوسری شادی ہو جانے کی امید لیے بیٹھے تھے کہ کوئی ان کا نام چلانے والا ہو۔ اسی آس میں اپنے سسرال میں بھی پابندی سے آتے تھے، مہرو سے شادی کے خواہش مند تھے اور اپنا پیغام بھی بھجوا چکے تھے، مگر بیگم نہال نے ابھی کوئی جواب نہ دیا تھا۔ دراصل وہ مہرو کو ان سے بیاہنا نہ چاہتی تھیں۔ یہ تو نہیں کہ سعید حسن ان کو پسند نہ تھے بلکہ وہ معراج کی دولت اور اس کے باپ کے بڑے عہدے پر ریجھی ہوئی تھیں۔ ویسے معراج کے مقابلے میں سعید حسن زیادہ معقول تھے اور بذاتِ خود بہت حلیم اور شریف مگر معراج کے والد میر وہاج الدین سے سمدھیانہ بھی تھا۔ وہ وحیدہ بیگم کے چچیرے جیٹھ ہوتے تھے اور یہ پیام وحیدہ بیگم ہی کی معرفت آیا تھا۔ لہٰذا سعید حسن کے پیغام قبول ہونے کے امکانات نہ تھے۔ ماں بیٹیوں کی متفق رائے سے معراج سے پہلے ہی نسبت طے ہو چکی تھی۔ محض رسمی طور سے کہنے والوں کو خبر نہیں کی تھی۔

"

معراج والوں کو جلدی تھی اور وہ لوگ برابر شادی کے تقاضے کر رہے تھے۔ بیگم نہال پھر پھر کر مہرو کا ذکر اپنے میاں سے اٹھاتیں اور وہ غور سے سنتے یا گول مول جواب دے کر خاموش ہو جاتے۔ اُن کو اپنی اولاد سے بے انتہا اُنس و محبت تھی۔

ایک بیٹی بھوپال میں بیاہ کر ان سے جدا ہو گئی تھی اور اب وہ مہرو کو کسی عنوان دُور پردیس میں دینے کے روادار نہ تھے۔ دنیا کے سرد و گرم دیکھے ہوئے تھے۔ خوب سمجھتے تھے کہ بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے اور مہرو سیانی بھی ہو گئی تھی اور اس کو اب اپنے گھر بار کا ہو جانا چاہیے تھا مگر اصغر کا بھی سوال تھا۔ چونکہ مہرو سے بڑا تھا ان کا خیال تھا پہلے اس کی شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔

سعید حسن کے جانے کے بعد ماں بیٹیوں میں اصغر کے متعلق باتوں کا سلسلہ پھر چل پڑا۔ وحیدہ بیگم نے بڑی سیاست سے پہلے تو کنبہ کی گئی اور لڑکیوں کے نام گنوائے جو اصغر کے لیے ثریا سے زیادہ موزوں ہو سکتی تھیں اور پھر دبی زبان سے کہا:

"کیوں اماں بلقیس اصغر کے لیے کیسی رہے گی؟ میرا مطلب بھائی اشفاق کی سالی سے ہے۔ میرے خیال میں تو اصغر کا عین مین جوڑ ہے۔"

بیگم نہال نے تیوری پر بل ڈال کر ناک چڑھائی اور بیٹی کے کہے کو قطعئ اہمیت نہ دی اور دیدے پھیر کر بے رُخی سے بولیں:

"ان کا ہمارا کیا میل۔ ہم سیّد وہ مغل بچے۔"

"لیکن اماں تم خدا لگتی کہو۔ لڑکی ہے بہت پیاری بھولی بھالی اور پھر گھرانا بھی امیر۔"

بیگم نہال نے زِچ ہو کر جواب دیا:

"اے پرے ہٹاؤ۔ موئی دولت کو لے کر کیا چاٹیں گے؟ آخر ہڈی بوٹی"

بھی تو دیکھی جاتی ہے۔ وہ مثل مشہور ہے کہ اصل سے خطا نہیں کم اصل سے وفا نہیں

اس پر وحیدہ بیگم نے کہا:

"آخر بھائی اشفاق کی شادی بھی تو وہیں ہوئی ہے۔ اب یہ ذات پات کے ڈھکوسلے چھوڑ دینے چاہئیں۔ دیکھو بھابی اشفاق کیسی ہنس مکھ ہیں اور میاں بھی سکھ چین سے ہیں۔"

بیگم جمال اس وقت سچ مچ خفا ہو گئیں اور تڑاخ کر جواب دیا:

"اشفاق کنویں میں گریں تو کیا ہم بھی گر جائیں؟ ان لوگوں کی نہ نسل درست نہ خون۔ بی وحیدہ جب تک میرے سانس باقی ہیں میری دہلیز پر سیدانی کے علاوہ کسی کا ڈولا نہیں آئے گا۔ تم میری بیٹی ہو کر یہ باتیں کر رہی ہو۔ میرا بیٹا اور مغل بچی! استغفار۔ تم پہلے مجھے زہر دے دو پھر اپنے بھائی کے لیے کرستان، فرنگن، چوڑی چمارن بیاہ لاؤ۔ اور وہ نہیں سُنا! مغل کا پوت گھڑی میں اولیا گھڑی میں بھوت۔ میرے جیتے جی یہ ہرگز نہ ہوگا۔"

وحیدہ بیگم نے دوپٹہ پھیلا کر دوبارہ ٹانکنا شروع کر دیا۔ انھیں کوئی معقول دلیل تو نہ سوجھ رہی تھی مگر کہنے لگیں:

"اور بھائی کریم کون سی سیدانی لائے ہیں۔ ان کی بیوی بھی تو مغل ہیں۔"

"اے بیٹی! آخر آج صبح تم نے کس کا منہ دیکھا ہے کہ بے سر و پیر کی ہانک رہی ہو۔ معلوم نہ ہو تو آدمی نہ بولے۔ کریم کی دلہن اصل نسل تیموری ہیں شجرے والی۔ نہ نسب میں فرق، نہ خون میں نقص۔ خاص شہزادوں کی اولاد، دربار والوں میں سے ہے۔ نواب زادی ہے کمبخت! بگڑی تڑی آئی لگائی اولاد نہیں، لو سن لو آج! مرزا شہباز بیگ کی بیوی لونڈی کے پیٹ سے ہیں۔ تو تمہارے سر پر آج بلقیس کیوں سوار ہو گئی۔ اور میرے آج کا اس وقت کیا ذکر تھا۔ بات اصغر کی شادی کی

ہو رہی ہے اور بیوی پھر بہر سو پشت کی بنیاد ہوئی ہے۔ ابھی تک تمہارے ددھیال ننھیال میں سب ہی سیّد زادیاں آئی ہیں۔ میں تو!! کیسے وہ بھولے آؤں جس کا خاندان ہی ہمارے میل کا نہ ہو۔ سب میرے ہی منہ پر تھوکیں گے اور تھڑی تھڑی کریں گے۔ بس ثریا بالکل ٹھیک ہے۔ اپنا خون۔ دیکھی بھالی۔ کہتے ہیں گھٹنے پیٹ ہی کی طرف مڑتے ہیں۔"

زمین ہموار ہو چکی تھی۔ وحیدہ بیگم نے موقع محل مناسب سمجھا اور اپنے ترکش کا آخری تیر چھوڑ دیا:

"اگر اصغر خود ہی بلقیس سے شادی کرنا چاہے تو؟"

اتنا سنتے ہی ماں کا پارہ چڑھ گیا اور جھلّا کے بولیں:

"کیسے کر سکتا ہے وہ۔ میں بھی تو دیکھوں۔ مجال ہے اس کی۔ میں جہاں چاہوں گی وہیں کرنی پڑے گی۔ کیا اسی دن کے واسطے تن چھپا کر بڑا کیا تھا کہ جب ہمارے ارمان پورے ہونے کے دن آئیں تو ساری کی کرائی پر پانی پھیر دیں۔ یہ نئی تانتی ہے۔ ٹانگ برابر کے چھوکرے بڑوں کے منہ آئیں۔ بچے کر لیں جہاں چاہیں۔ مجھے بھی سیدانی نہ کہنا، نالو چمار ہی کہنا! جو دودھ بخش دیا ہو۔"

بیٹی نے ماں کی خفگی کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر زور دیا:

"تم دودھ بخشو یا نہ بخشو وہ تو ٹھانے بیٹھا ہے۔ کہتا ہے، کروں تو بلقیس سے کروں ورنہ۔"

اماں نے بیٹی کی بات کاٹ دی:

"اے بی یہ چھیڑ خانی تو تم اپنی کسی ہمجولی سے کرتا۔"

"نہیں اماں۔ کیا میری یہ مجال کہ تم سے مذاق کروں؟ اپنے ننھے کی قسم کھا کر کہتی ہوں اس نے تو بلقیس سے شادی کرنے کی ٹھان لی ہے۔ کل ہی مجھ

سے کہہ رہا تھا۔ شیطان کے کان بہرے، کہتا ہے بلقیس سے نہ ہوئی تو جان دے دوں گا۔"

بیگم نہال یہ جملہ سُن کر دنگ رہ گئیں اور چھاتی پیٹ کر بولیں:

"ہے ہے۔ سچ کہو حمیدہ۔ اللہ میری خطائیں بخشیو۔ آج یہ کیا ہوئی شدنی سُن رہی ہوں۔ اے لڑکے کی مت ماری گئی ہے۔ باوا کے کان میں پڑ گئی تو کچے ہی کو چبا جائیں گے۔ اوئی کیا بلقیس کو جورو بنا کر باپ دادا کی ناک کٹوائے گا؟ نوج بوا، ایسی بدفالیاں تو جمعرات کے جمعرات نہ نکالو۔ میرا تو سُن کر کلیجہ شق ہوا جاتا ہے۔ چھوڑو اس ذکر کو کوئی اور بات کرو۔"

"مگر اس کی خلافِ مرضی شادی ہوئی تو پھر؟"

بیگم نہال کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو ڈبڈبا آئے اور ایک ایک کر کے رخسار پر بہنے لگے۔ وہ ... جیکاری

میں سے ہیں۔ انھوں نے تو کہیں کچھ .....“

جمال بیگم اسی وقت کوٹھے پر سے اُتر رہی تھیں، جوں ہی اپنا نام سنا وہیں پوچھا:

"میرا کیا ذکر تھا دُلہن؟"

بیگم نہال بھری تو پہلے ہی بیٹھی تھیں، جھلا کر بولیں:

"اے بی تمہارا نام تو میرے فرشتوں نے بھی نہیں لیا۔ تم تو بھابی جان چلتی ہَوا کے سر ہو جاتی ہو۔"

جمال بیگم صحن میں پہنچ چکی تھیں کہنے لگیں:

"تو کیا میرے کان بج رہے تھے؟ میں نے خود سُنا ہے۔ دُلہن تمہاری تو وہی کہاوت ہے: یہ بھی کہہ لوں، وہ بھی کہہ لوں، دل کو رکھوں شاد۔ مجھے یہ طرح بھی یاد، مجھے وہ طرح بھی یاد۔"

جمال بیگم جٹھانی تھیں اور بیگم نہال اُن کا لحاظ کرتی تھیں، کہنے لگیں:

"بوا مجھے تڑاخ پڑاخ کرنے کی عادت نہیں۔ نہ میں تمہاری طرح کن سوئیاں لیتی پھروں۔ تم کو تو اللہ مارا یہ وہم ہو گیا ہے کہ ہر شخص تم ہی کو برا بھلا کہتا ہے، جیسے دُنیا جہان میں کوئی اور کام ہی نہیں۔"

جمال بیگم تو ترکی بہ ترکی جواب دینے کی ماہر تھیں، بولیں:

"کسی کو کام ہو یا نہ ہو مگر اس وقت میرا نام ضرور لیا جا رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ بات تو تھی آخر۔ اب کہتی کیوں نہیں ہو؟ میں تو خود منہ چھپائے الگ تھلگ اٹریا پہ بیٹھی رہتی ہوں۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ پھر بھی جس کو دیکھو مجھ ہی سے اللہ واسطے کا بیر، میرے سر ہر اچھی بُری تھوپے جاتا ہے۔ بس صاف بات ہے۔ تم لوگوں کو میرا یہاں رہنا دوبھر ہو گیا ہے۔ آج ہی ڈولی منگا کر کہیں نکل کھڑی ہوں گی۔ تم کو

مبارک ہو بیوی اپنا گھر۔ جس نے پیدا کیا ہے سر چھپانے کا بھی کر دے گا۔"
بیگم نہال بیزار ہو رہی تھیں۔ کہنے لگیں:
"مہیں ہو کیا گیا ہے آخر۔ کیا رات کو کھرّی چار پائی پر سوئی تھیں؟ زبان پکڑے لیتی ہو۔ بھلا اس وقت کوئی بات بھی ایسی ہوئی جو تم کوٹھے سے اُترتے ہی مجھ سے اُلجھنے لگیں۔ میں گھر والی کون۔ خدا تمہارے دیور کے دم کو رکھے تم جانو تمہارے دیور۔ میں نے تم سے آج تلک زبان نہ کی اور تم ہمیشہ گھر کے طعنے کوسنے دے کر میرے ہی جی کے لگاتی ہو۔"
"لو بنو تم تو بگڑ گئیں۔ اے وہ کھونٹا ہی نہیں رہا جس پہ کود کود کر میں کسی سے مان کر دں۔ کہتے ہیں خصم راج، آپ راج اور پوت راج محتاج راج۔ اپنا تو کوئی سر دھرا نہ نام لیوا اور نہ پانی دیوا۔"
بیگم نہال سمجھ گئیں کہ بھابی جان بات کا بتنگڑ بنانے پر آمادہ ہیں۔ اپنا پنڈ چھڑانے کو یہ کہہ کر اُٹھ گئیں:
"بی مجھے تو للہ بخشو۔ میں تو خود ان دنوں اپنے تئیں سے بیزار ہوں۔" اور باورچی خانہ میں چلی گئیں۔ کھانے کا وقت آرہا تھا۔ دھوپ سارے صحن میں بھر گئی تھی۔ ڈیوڑھی میں سے میر نہال کے کھنکھار کے اندر آنے کی چاپ سنائی دی —
وحیدو بیگم سنبھل کر بیٹھ گئیں اور سر پہ دوپٹہ اوڑھ لیا۔ جمال بیگم صحنچی میں جا کر بڑبڑاتی رہیں......
دیوار پہ دو کوّے موری کے پاس پڑی ہوئی ہڈی پہ تاک لگائے گردنیں ہلا ہلا کر کائیں کائیں کر رہے تھے۔

۸

بلا کی گرمی تھی اور غضب کا حبس۔ کئی دن سے اندھیا چڑھا ہوا تھا اور آسمان تپ کر تانبا ہو گیا تھا۔ لو کے جھکڑ چلتے، در و دیوار سے لپٹیں نکلتیں اور ذرّے چنگاریوں کی طرح گرم ہو جاتے۔ ساری فضا چٹیل میدانوں کی طرح ویران اور بے رونق تھی۔ تیسرے پہر یکایک اکا دکا چیلیں مغرب سے آتی ہوئی دکھائی دیں پھر تو ان کے غول کے غول آنے شروع ہو گئے جو کاوے کاٹتے کاٹتے آسمان پر اونچے ہوتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر تک تو چیلیں حلقہ بنا کر آہستہ آہستہ کاوے کاٹتی رہیں پھر عین سر پر آ گئیں۔ ان کے ایک جگہ جمع ہوتے ہی ہوا کی تیزی ایک دم بڑھ گئی۔ آسمان زرد پڑ گیا اور مغربی اُفق تانبے کی طرح سرخ نظر آنے لگا۔ ہوا کا زور اور بڑھا اور زمین سے گرد کے ستون اُٹھنے لگے۔ پھر تو ریت اس شدت سے اڑنی شروع ہوئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی پوشیدہ اور زبردست طاقت منوں مٹی بھر بھر کے اُچھال رہی ہے۔ سورج خاک کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اور ریت کے ذرّے اس کی روشنی میں انگاروں کی طرح دہک اُٹھے۔ پورا آسمان گہرا نارنجی اور لال ہو گیا۔ چیلیں چلچلاتی

ہوئی مخالف سمت میں بڑھ گئیں

اُن کے جانے کے بعد ہوا ذرا رُکی اور فضا ساکن ہوگئی۔ یہ ٹھہراؤ ایسا ہی تھا جیسے کسی کی پیدائش سے پہلے ہوتا ہے لیکن اس کے بعد تو وہ زوردار آندھی چلنی شروع ہوگئی کہ اللہ کی پناہ۔ ہوا زنّاٹے بھرتی ہوئی مکانوں، چھتوں اور درختوں سے ٹکرانے لگی۔ آندھی کے بھرپور جھکڑوں سے کھڑکیاں اور کواڑ دھڑ دھڑ کرنے لگے۔ در و دیوار اس طرح ہل گئے جیسے کوئی ان کو جھنجھوڑ رہا ہو۔ جوں جوں طوفان کی تیزی و تندی بڑھتی گئی۔ ٹین کی چھتیں اور سائبان بجنے لگے اور چیزوں کے گرنے اور برتنوں کے لڑھکنے کی آواز نے آندھی کے غرّاٹے میں اور بھی وحشت پیدا کر دی۔

چڑیاں مہندی کی شاخوں میں سمٹ کر دُبک گئیں۔ آفت کا مارا ایک کوّا کھجور کے پتّوں کو پنجوں سے دبوچے ہوئے سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا۔ آسمان پر چڑھا ہوا گرد و غبار زمین پر ایسے برس رہا تھا جیسے ایک ٹڈی دَل سبزہ دیکھ کر اُتر آتا ہے۔ مہندی کا درخت جھکولے کھاتا اور اُس کی پتیاں جھڑ جھڑ کر ہوا میں اُڑ جاتیں۔ کھجور اس طرح چرچر کرتی جیسے اب وہ گر جائے گی، اور دُوہری ہو ہو کر چھت تک جُھک جاتی۔ ریت کمروں میں بھر گیا اور آنکھوں میں گھسنے لگا۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھا اور سفید چاندنی پر اُنگل اُنگل بھر تہہ بچھ گئی۔ سورج چھپ گیا اور روشنی غائب ہوگئی، حتیٰ کہ چاروں طرف اندھیرا ہوگیا۔ مٹّی اور خاک سے فضا اتنی مکدّر ہوئی کہ سانس لینا بھی دشوار ہوگیا اور دم گھٹنے لگا۔

بیگم نہال نے مہرو، مسرور اور بچّوں کو کمرے میں بلا لیا۔ دلچین جلدی جلدی انگنائی میں بکھرے ہوئے کپڑوں کو سمیٹنے لگی۔ جمال بیگم اور اُن کی بھاوج کوٹھے پر سے نیچے اُتر آئیں اور سب نے مل کر دالان والے شہ نشین میں پناہ لی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور ہوا کا غنّاٹا اور بھی زور سے سنائی دیتا تھا۔

"خدا کے لیے کوئی پائے کے نیچے جھاڑو تو دبا دو۔" بیگم جمال نے چیخ کر کہا: "کالا منہ اِس آندھی کا۔ معلوم ہوتا ہے قیامت ابھی سے آگئی۔" اور وہ زور زور سے جل تو جلال تو پڑھنے لگیں۔

"ارے کسی نے مجید کو بھی دیکھا ہے؟" بیگم نہال نے پوچھا۔

اتنے میں دلچین لالٹین لے آئی اور سب کی جان میں جان آئی۔

"میں یہ رہا نانی جان!" وحیدہ بیگم کے بیٹے نے کہا اور جُھک کر چھپر کھٹ کے پائے کے نیچے جھاڑو دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ بھلا آٹھ برس کے بچے کی کیا بساط تھی جو چھپر کھٹ کو اُٹھا سکتا۔ دلچین نے جاکر سہارا دیا۔

بیگم نہال نے آیۃ الکرسی کا حصار کھینچ کر زُور زُور سے تین تالیاں بجائیں۔

وحیدہ بیگم کی بیٹی رُقیہ سر کھلی بیٹھی تھی، انجم زمانی بولیں:

"اے بنّو سر تو ڈھک لے۔ کورا بنڈا او دُور پرے کہیں کسی کا ایسا ویسا سایہ نہ پڑ جائے۔"

وحیدہ بیگم نے مجید کو اپنے پاس بٹھا کر دوپٹہ میں لپیٹ لیا تھا اور نظر گزر کے ڈر سے پھونک پھونک کر دم کر رہی تھیں۔ بچہ ان باتوں سے اکتا گیا اور مہر دے پوچھنے لگا:

"خالہ جان یہ جھاڑو کیوں دباتے ہیں؟"

"بڑے بوڑھے کہتے چلے آئے ہیں کہ جھاڑو دبانے سے آندھی اُتر جاتی ہے۔"

رُقیہ بولی:

"معلوم ہوتا ہے جنّاتوں کے بادشاہ کی برات جا رہی ہے۔"

اور مجید ماں کے پہلو سے نکل کر جنوں کی برات کا تماشا دیکھنے باہر جانے لگا جمال بیگم کانوں میں اُنگلیاں ٹھونسے بیٹھی تھیں فوراً لتا ڑا:

" لڑکے تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟ باہر جا کر تو دیکھ۔ تیری ٹانگیں توڑ ڈالونگی"۔
بچّہ تو وہیں کا وہیں ڈر کر بیٹھ گیا، اور جمال بیگم حسبِ دستور مار کے نئے زمانے کا رونا
رونے لگیں:

" آجکل کی پود کے دیدے پھٹ گئے ہیں۔ توبہ ہے میرے گناہوں کی۔ دیدہ دلیری تو دیکھو۔ نہ آندھی سے ڈریں، نہ مینھ سے......"

جسم خاک سے اٹ گئے۔ پسینہ میں مٹی اور کاٹنے لگی۔ دانتوں میں رہ رہ کر کرکرہ ہوتی اور بال ریت سے اُلجھ کر مکڑی کا جالا بن گئے۔

خدا خدا کر کے آندھی کا زور ٹوٹا اور کچھ دیر میں چلنی بند ہوگئی، گو ابھی تک اندھیرا اور گرد و غبار باقی تھا۔ سب اندر بیٹھے ہوئے روشنی کا انتظار کر رہے تھے۔ طوفان تھمتے ہی بیگم نہال کو اصغر کا خیال آ گیا اور بیٹی کے قریب کھسک کر کان میں کہا:

" مجھے تو اصغر کی طرف سے فکر ہوگئی ہے۔ بُرے بُرے وسوسے دل میں آتے ہیں۔ بیٹی مجھے تو کچھ بن نہیں آتی۔ تم ہی کچھ سوچو۔"

وحیدہ بیگم بولیں:

" امّاں تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں تو خود حکیمہ میں ہوں اور ہر دم یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اس کے دشمن کہیں کچھ کر نہ بیٹھیں۔ بچپن کا ہٹیلا ہے۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کیسا کیسا مچلتا تھا، اور جب تک من مانی کروا نہ لیتا ضد کرتا رہتا تھا اور امّاں سچ تو یہ ہے کہ اس کا نصیبا بھی خراب ہے۔ سوچو تو اس کے کون سے ارمان نکلے ہیں....."

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

دوسرے کونے میں جمال بیگم حسبِ معمول شکایت کر رہی تھیں:

" اللہ میاں کو بھی تو دیکھو کوئی کام ہی نہیں رہا۔ آئے دن نت نئی آفتیں

توڑتے رہتے ہیں۔ کچھ نہیں تو آندھی چلادی۔"
"ہے ہے آپا تم کو کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری زبان ہے کہ کسی طرح نہیں رُکتی۔
اب اللہ میاں، کے سَر ہو گئیں۔" انجم زبانی نے ٹوکا.....
"جب آندھی آتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔" مجید کی آواز آئی۔
"بزرگوں کا کہنا ہے جب جن بیاہ رچاتے ہیں تو اُن کی برات آندھی پانی کے ساتھ جاتی ہے۔" کسی نے جواب دیا۔
"لیکن ہمیں تو کوئی برات دکھائی نہیں دیتی۔ جن کون ہوتے ہیں؟" مجید نے پوچھا۔ بیگم جمال نے بیٹھے بیٹھے پھر للکارا:
"بس کر چھو کرے۔ للّو کا تانتا ہی ٹوٹ گیا۔ ہر بات پوچھ پوچھ کرنا طقہ بند کر دیا، یہاں مارے ہولوں کے دم ہوا ہُوا جاتا ہے۔" اور وہ جل تو جلال تو اور زور زور سے پڑھنے لگیں۔
انجم زمانی نے مجید کے سوال کا جواب دیا:
"چند اوہ بھی ہماری تمہاری طرح اللہ کی مخلوق ہیں۔ ہمیں زمیں سے بنایا ہے اُنھیں آگ سے۔"
"پھر تو وہ جلتے ہوئے ہوں گے۔"
"نہیں بیٹا وہ جلتے ہوئے نہیں ہوتے۔ ہم اُن کو چھو تھوڑی سکتے ہیں۔"
"کیا وہ بُرے ہوتے ہیں؟"
"ان میں سے جو کافر ہیں وہ غُصّے ور اور بُرے ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر تو ہماری تمہاری طرح مسلمان ہیں اور کسی کو نہیں ستاتے....."
بیگم نہال چپکے چپکے کہہ رہی تھیں:
"مجھے تو باپ بیٹوں کی ضد دیوانہ کر دے گی۔ میرا مولا جانتا ہے کہ راتوں

کی نیند حرام ہے۔ تم ہی تدبیر بتاؤ میں کیا کروں۔ نہ اصغر سنتا ہے نہ تمہارے ابا مانتے ہیں۔ جب بھی میں نے کہا اُلٹے مجھ پر لال پیلے ہوکر دیدے نکالنے لگتے ہیں۔ بھلا وہ کیسے راضی ہو جائیں گے۔ جب موئے بُندو سے اصغر کی دوستی ہی انھیں ایک پل گوارا نہیں .....“

”بس تو پھر لڑکے سے ہاتھ دھو بیٹھو“ وحیدہ بیگم مایوسی سے بولیں:
”آخر ہوگا کیا اس ضدم ضدا کا نتیجہ؟“ اور دونوں چپ ہوگئیں ..... تھوڑی دیر بعد بیٹی نے کہا:

”اماں تم کسی نہ کسی طرح ابا کو راضی کرلو نا؟“

”بیٹی کہنا آسان ہے کرنا مشکل۔ اپنے ابا کا مزاج تم کو معلوم ہی ہے۔ بھڑوں کے چھتے کو چھیڑتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ذرا میں زمین و آسمان ایک کردیں گے۔“

باہر گرد کے بادل چھٹنے شروع ہوگئے تھے۔ تھوڑا تھوڑا اجالا ہونے لگا اور لالٹین کی روشنی پھیکی پڑ گئی۔ بیٹی نے اصرار کیا:
”اماں اصغر کی جان کی خاطر کوئی نہ کوئی جتن تو کرنا پڑے گا اس کے دشمن زہر وہر نہ کھالیں۔“

ماں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہنے لگیں:
”ہاں بی۔ اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل کا کیا ڈر۔ دیکھو۔ بچے کی خاطر اپنی سی تو کروں گی ....“

دھوپ نکل آئی تھی اور ہر چیز صاف دکھائی دینے لگی۔ دلچسپن دم سادھے ماں بیٹی کی کانا پھوسی سن رہی تھی۔ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی بولی:
”کالا منہ آندھی نگوڑی کو اسی وقت آنا تھا۔ میرا تو پکانا ریندھنا پڑا ہے۔“

اور اُس نے اُٹھ کر دَروازے کھول دیے۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ لالٹین گُل کر دی گئی۔ گو خاک اتر چکی تھی لیکن مطلع پوری طرح صاف نہ ہوا تھا۔ سقّے نے پکارا "مشک آئی ہے" اور لال اندھیری مُنہ پر ڈال اندر آ کے گھڑونچی پر رکھے ہوئے مٹکوں میں جن کے پیندے کائی سے سبز ہو رہے تھے، پانی بھر دیا۔ سب اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ جمال بیگم اور انجم زمانی کوٹھے پر چلی گئیں۔ مجید باہر آ کر آسمان کو غور غور سے دیکھ رہا تھا۔ جنوں کی اسے ابھی تک جستجو تھی۔

۹

جیٹھ کا مہینہ تھا العطش گرمی پڑ رہی تھی۔ صبح سے لُو چلنی شروع ہو جاتی اور دوپہریں اس قدر سنسان ہوتیں کہ زندگی کی سنگینی اور بڑھ جاتی۔

بیگم نہال نے جب سے اصغر کے زہر کھا لینے کا بیٹی سے سُنا تھا مارے ہَولوں کے سہمی جا رہی تھیں۔ ایک پھانس تھی کہ رہ رہ کر سینے میں کھٹکے جاتی اور ایک غم تھا جو اُن کو کھائے جاتا تھا۔ وہ تمام وقت کھوئی کھوئی بے زاری بیٹھی رہتیں۔ دِلچین آکر پوچھتی:

"کیا پکے گا بیوی؟" ــــ تو بے دلی سے کہہ دیتیں کہ "جا کر حمیدہ بیگم سے پوچھ لے" ــــ اور پھر اپنی اُدھیڑ بُن میں لگ جاتیں۔ لیکن گتھی وہ اُلجھی تھی کہ اُن کے سُلجھائے نہ سُلجھتی۔ منصوبے بناتیں، توڑ دیتیں، حل ڈھونڈتیں اور مایوس ہو جاتیں۔ کسی طرح یہ بیل منڈھے چڑھتے نہ نظر آتی۔ وہ اصغر کو ویسے بھی بہت چاہتی تھیں اور میر نہال جو اس پر سخت گیری کرتے تھے اس کی وجہ سے وہ ان کا اور لاڈلا ہو گیا تھا۔ اور ان کو یہی خیال تھا کہ اُس کے ساتھ ہمیشہ زیادتی

ہوئی ہے۔ اس کی ہر خواہش ناتمام ہی رہی۔ اب وہ اس کی حسبِ منشا شادی کرکے بدقسمتی کا ازالہ اور گزشتہ بے پروائیوں کا تدارک کرنا چاہتی تھیں۔ اولاد کی مصیبتیں، ان کے رنج وملال، ایک ماں کا دل خوب سمجھتا ہے اور وہ بھی اپنی ماتما سے مجبور تھیں۔ ان کے بس کی بات ہوتی تو اسی وقت کھڑے کھڑے ہاتھ پکڑ کر اصغری کی من بھائی دُلہن لے آتیں۔ مگر بغیر باپ کی رضا کے یہ کس طرح ممکن تھا؟ پھر ان کو نظر انداز بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ چاہتی تھیں کوئی تدبیر غیب سے نکل آئے چوبیسوں گھڑی وظیفہ وظائف کا وِرد ہوتا۔ راتوں کو جب سارا عالم سوتا تھا یہ سجدے میں گڑگڑا کے بیٹے کی سلامتی اور اُس کی مراد بر آنے کی دعائیں مانگتیں علی مُشکل کُشا کا دونا اور علی اکبر کا سہرا، سب ہی منتیں مان رکھی تھیں میاں سے ڈرتی تھیں اور رُو بہ رُو بات کرتے ہوئے ہمیشہ کتراتی تھیں اور اب تو اس فکر میں گھلی جا رہی تھیں کہ اگر انھوں نے انکار کر دیا تو پھر کیا ہوگا؟ اُٹھتے بیٹھتے وحیدہ نے کہہ کہہ کر بہتیری ہمت دلائی اور کچھ ماتما کے جوش نے ابھارا تو انھوں نے بھی سوچ لیا، جو ہونا ہے فیصلہ ایک دفعہ ہی ہو جائے۔ بات کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر کار آندھی کے اگلے ہی روز انھوں نے میر نہال کو اندر بُلوا بھیجا۔

میر نہال اندر آئے اور بیوی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولے:

"کیوں خیر تو ہے؟ سویرے سویرے میری طلبی کیسے ہوئی؟"

"تم کو تو قسم ہے خود کبھی گھر کی خبر ہی نہیں لیتے۔"

"آخر میں کیا کروں۔ کیا ہنڈیا ڈوئی لے کر بیٹھ جاؤں؟"

"تمہاری باتیں تو سدا عجیب ہوتی ہیں یا اِس پار یا اُس پار۔"

میر نہال زیرِ لب مسکرائے اور شگفتگی سے بولے:

"تو پھر فرمایئے جناب کا مطلب، مدعا، مقصد۔ کیوں غلام کو حاضری کا

حکم ہوا تھا؟"

بیگم نہال نے میاں کو خوش دیکھ کر فائدہ اُٹھایا اور کہنے لگیں:

"اب تو بڑھے طوطے ہو گئے۔ جوانی میں کب میرا مدعا مطلب پوچھا تھا، بس میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ یہ موئی کبوتر بازی چھوڑ دو"

میر نہال بے ساختہ ہنس پڑے۔

"لو اتنی سی بات تھی۔ تم بھی کمال کرتی ہو۔ کسی بچے کے ہاتھ کہلوا دیا ہوتا مجھے خواہ مخواہ بلوایا۔ مگر میرے کبوتر تمہارا کیا لیتے ہیں؟"

"موئی بلیوں نے اس گھر کا رستا دیکھ لیا ہے۔ رکھاڑ معکا چٹ کر جاتی ہیں"

"تو تم بھی ایک کتا کیوں نہیں پال لیتیں؟"

"اے لوج! پالے میری بلا۔ جہاں کتا ہو وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے"۔

بیوی کی باتوں پر وہ ہنستے ہوئے جانے کو اُٹھے، لیکن خلاف معمول بیوی کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر پھر بیٹھ گئے اور نرمی سے کہا:

"تم کچھ فکرمند نظر آ رہی ہو؟ آخر کیا بات ہے؟ مجھ سے کہو نا"

بیگم نہال بولیں:

"بات تو کچھ بھی نہیں بس اصغر کے بیاہ کے متعلق پوچھنا چاہتی ہوں۔ کبھی تم نے سوچا بھی۔ اللہ رکھے جوان ہو گیا ہے۔ اس کا بھی گھر آباد کرنا چاہیے"

"کہتی تو ٹھیک ہو"

"ہاں مگر تم تو آنکھ اُلٹ کر نہ دیکھو نہ پوچھو۔ نگوڑے کبوتروں سے تم کو فرصت ہی نہیں ملتی جو بچوں کا خیال آئے" ـــــ میر نہال نے

جواب دیا:۔

"جب تم مجھ سے زیادہ فکر کرنے والی موجود ہو تو پھر مجھے فکر کی کیا پڑی ہے۔ دوسرے بیٹوں کی بھی تم نے شادیاں کی ہیں۔ آخر اب کیا نئی بات ہو گئی۔ اصغر کے لیے بھی ڈھونڈ لاؤ۔ لڑکی دیکھنا دکھانا عورتوں کا کام ہے۔ میں نے کبھی دخل دیا ہے؟"

"میں نے تو ڈھونڈ لی ہے، مگر تم باپ ہو اور تمہاری مرضی بھی ضروری ہے۔ اب تمہارا عندیہ معلوم ہو جائے تو کنبہ کا منہ میٹھا کر دوں۔"

"کونسی صاحبزادی کا انتخاب ہوا؟"

اس سوال پر بیگم نہال دل کڑا کر کے بولیں:

"مرزا شہباز بیگ کی منجھلی لڑکی کیسی رہے گی؟"

"یہ مذاق تو رہنے دو۔ میرے خیال میں نصیرالدین کی لڑکی موزوں ہے۔ رُقعہ بھیج دو۔"

بیگم نہال کی آنکھوں میں پریشانی جھلکنے لگی اور وہ فکرمندی سے بولیں:

"بھلا مجھے مذاق کی کیا پڑی ہے؟ سچ سچ کہہ رہی ہوں تم سے۔"

"کیا کہا؟" میر نہال نے تعجب سے پوچھا۔

آج وہ بھی تُلی بیٹھی تھیں کہ معاملہ اِدھر ہو یا اُدھر۔ کہنے لگیں:

"یہی کہا ہے کہ مرزا شہباز بیگ کی بیٹی کیسی ہے۔ بھائی نصیرالدین کی لڑکی تو اصغر کو سرے سے پسند ہی نہیں۔ وہ تو بلقیس سے کرنی چاہتا ہے، کسی اور سے بھی کرنے کو تیار نہیں۔"

میر نہال برہم ہو گئے مگر غصہ کو ضبط کرتے ہوئے فیصلہ کُن لہجہ میں جواب دیا:۔

"کیسے کر سکتا ہے وہ! کیا دیوانہ ہوگیا ہے۔ یہ تو قطعی ناممکن ہے!"

یہ سنتے ہی بیگم نہال کے چہرے کا رنگ تو فق ہوگیا۔ لیکن بیٹے کی محبت نے اُن کو نڈر بنا دیا تھا اور وہ جنگ کے لیے پوری طرح آمادہ تھیں۔ وثوق سے کہنے لگیں:

"آخر اس میں حرج کیا ہے، ڈھنگ، گُن، صورت، سب طرح اچھی ہے!"

میر نہال کو تو اب تاب نہ رہی غصہ سے خون کھولنے لگا۔ کان سُرخ پڑ گئے، معلوم ہوتا تھا بھری محفل میں کسی نے ان کی ٹوپی اتار لی ہے۔ جھلّا کر بولے:

"بیشک اس میں کوئی حرج نہیں! اپنے صاحبزادے کے ساتھ تمہاری عقل بھی چرنے چلی گئی۔ میرا بیٹا، میر کمال کا پوتا اور شہباز مرزا کی بیٹی کو جورو بنائے اور اماں جان بڑی سُرخرو بن کر خود اس کی سفارش میں پیش پیش۔ بھٹکار ہے۔ غیرت ہو تو چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کی جا ہے۔ آخر میری عزّت کا تو کچھ پاس کرو۔ زمانے نے اور کچھ نہیں چھوڑا، ایک عزّتِ سادات لیے بیٹھے ہیں وہ تو رہنے دو۔ اصغر سے زیادہ مجھے تم پر حیرت ہے کہ اس بڑھاپے میں اوندھی اوندھی باتیں کرتی ہو۔ نہیں! یہ رشتہ ہرگز نہیں ہوسکتا.....!"

گلی میں اُپلے والا آواز لگا رہا تھا: "کنڈے لو جی کنڈے ایندھن کو!" ایک گدھا اچانک بے سُرے آواز سے رینکنے لگا اور دوسرے گدھے نے بھی اس کی آواز سن کر اُس کی ڈھینچوں ڈھینچوں میں سُر ملا دیا.....

بیگم نہال کو اپنی شکست کا پورا اندازہ تھا لیکن وہ بھی جھکنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ کہنے لگیں:

"آخر چراغ پا ہونے کی کیا بات ہے۔ کوئی رنڈی منڈی بیسوا سے تو نہیں کر رہا جو تمہاری ناک کٹے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ جس کی شادی ہو رہی ہے

اس کی مرضی بھی تو دیکھنی لازمی ہے۔"

میر نہال کے پندار، حمیت اور شرافت کو ایسا دھچکا لگا تھا کہ اُن کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ وہ آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ بھنّا کر بولے:

"بس کرو۔ اب میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا۔ کان کھول کر سن لو یہ رشتہ مجھے سراسر نامنظور ہے۔ پہلے ہی تم کو منع کیا تھا کہ اصغر کا اس کم ظرف بندو سے خلا ملا نہ ہونے دو۔ مگر تم نے میرا کہا نہ مانا بلکہ ہمیشہ اس کی حمایت میں بولیں۔ مجھے تو انجام معلوم تھا کہ اس سے دوستی رنگ لائیگی اور تمہارے صاحبزادے یہی گل کھلائیں گے۔"

"لے اُس نے تو کوئی گل وُل نہیں کھلائے۔ اپنی جوانی کے دن ذرا یاد کرو۔"

"اجی سب یاد ہے۔ اس طرح دل کو ہتھیلی پہ لئے کر نہیں پھرے تھے کہ باپ دادا کے نام پر بٹہ لگ جائے۔"

"اے بس کرو۔ تم نے کون سی کسر چھوڑی تھی۔ آج تک میرا کلیجہ چھلنی ہے اور ایمان کی تو یہ ہے کہ تم نے اس کے ساتھ سراسر ظلم کیے۔ اس کی ہر خواہش کو ٹھکرا دیا۔ علی گڑھ پڑھنے جانا چاہتا تھا تم نے ہی جانے نہ دیا اور وہ غریب دل مسوس کر رہ گیا۔ تمہارے حکم کے سامنے اُف تک نہ کی۔"

"اجی علی گڑھ جانے دیتا تو صاحبزادے وہ کینچلی بدل کر لاٹ بہادر اور دہریے بنتے کہ تمہیں کو سانپ کا سا پھن دکھا کر کہتے لے دیکھ میری ذات صورت دیکھنے کو ترستیں۔"

"بھلا تھا صورت کو ترستی۔ یہ رات دن کا جلا پانو نہ ہوتا۔ تم تو دن بھر کبوتر بازی کرو، رات گئے گھر میں گھسو، تم کو کیا خبر۔ اندر ہی اندر وہ گھل کر کانٹا ہوگیا اور ماں بندی ٹکر ٹکر دیکھتی ہے۔"

Scanned by CamScanner

"ایسی باتوں کے یہی نتیجے ہوں گے۔"

"کونسی باتیں! سیدھے سبھاؤ شادی کرنی چاہتا ہے۔ اپنی پسند کی اللہ رسول نے بھی اجازت دی ہے۔ اس سے ایسی کونسی تقصیر ہوگئی جو تم چھینک پیٹ رہے ہو۔ مرد وئے ماما اصیلوں سے آشنائی کرلیں وہ اچھا۔ رنڈی کے کوٹھوں پر جائیں، وہ سب روا۔ جب خاندان اور غیرت کہاں اڑ جاتی ہے؟"

جیسے کسی نے دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا ہو، میر نہال پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولے:

"آخر تم چاہتی کیا ہو۔ دنیا کے سامنے بے آبرو ہو جاؤں، رہی سہی عزت گنوا دوں، کسی سے آنکھ ملا کر بات نہ کرسکوں؟ تُف ہے ایسی زندگی پر۔ بھٹ پڑے وہ سُونا جس سے چھیدیں کان......"

"تریا ہٹ، بالک ہٹ سُنی تھی یہ باوا ہٹ آج ہی دیکھی۔ اور وہ بھی تمہارا اصل نسل بیٹا ہے۔ کہتا ہے کچھ کھا کر جان دے دوں گا۔"

میر نہال کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ کڑک کر بولے:

"خس کم جہاں پاک۔"

بیگم نہال بگڑ گئیں:

"گھڑی دیکھو نہ ساعت، کون وقت کیسا۔ تم نے تو پھٹ سے مُنہ بھر کے کہہ دیا۔ نصیب دشمناں کوئی ناگہانی کر بیٹھا تو تم ہی ہائے کر کے بتاشے کی طرح بیٹھ جاؤ گے۔ فضل الٰہی کو دیکھو لو۔ کلیجہ تھامے تھامے پھر رہے ہیں۔ تمہاری تو ریت ہی نرالی ہے۔ باپ ہونے کا تقاضا تھا کہ غلطی بھی کر رہا ہے تو لیپ پوت دو مگر تم تو بگڑی اور اچھال کر تماشا دکھاتے ہو۔ خدا کی قسم تمہارا برتاؤ سوتیلوں کا سا ہے اس کے ساتھ۔"

"میرا برتاؤ جیسا ہو تم اچٹن اچٹن کر لو۔ مگر میں کہے دیتا ہوں میرے جیتے جی اس گھر میں کسی کی نہ چلے گی۔ بد لحاظ کو نہ شرم رہی نہ حیا، نہ پاسِ خاندان۔ اُس نا ہنجار سے کہہ دینا میرزا جی کی بیٹی سے شادی کرتا ہے تو کر لے میری جوتی کی نوک سے۔ مگر میں بھی عاق کر دوں گا۔ پھر میرا اُس کا کوئی واسطہ نہ ہوگا۔ میرے جنازے میں بھی شریک نہ ہو۔ میں اُس کی صورت تو کیا ہاتھ سے پانی پینے کا روادار نہ ہونگا۔ وہ جانے اس کا کام"

"تمہاری طرح ساری دُنیا کوئی باوا آدم سے تو شجرہ ملاتی نہیں۔ اچھے خاصے عزّت دار لوگ ہیں۔ جیسے تم ہی تو ایک ساکھ والے خاندانی رہ گئے ہو۔"

"کیا کالا منہ اور نیلے ہاتھ پاؤں کر کے گدھے پر سوار کرواؤ گی جب ہی سمجھو گی رُسوائی ہوئی۔ لے آؤ مرزا جی کی بیٹی۔ تمہیں کو پاؤں کی جوتی نہ بنایا ہو [illegible] کی خصلت تو اسی

گلی کے پتھروں پر پھسل کر دیوار سے ٹکرا گیا۔ سارے اُپلے مونجھ کی کھانس میں سے زمین پر آرہے تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور دھانس میر نہال کی ناک میں گھس گئی۔ وہ چھینکتے ہوئے گدھے والے پر بنکارنے لگے۔ وہ گڑگڑا کر معافیاں مانگنے لگا، "ابکے تو گھتا ہوئی ماپی دوسر کا رجی گلتی ہو گئی گدھے سے" اور دونوں ہاتھوں سے اُپلے جھول میں بھرنے لگا۔

میر نہال کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہ ہوا تھا اور وہ بپھرتے ہوئے ایک شیر کی طرح کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگے۔ کبوتر بازوں کی سیٹیاں برابر فضا میں گونج رہی تھیں۔ چیلیں پھر جمع ہونی شروع ہو گئیں تھیں اور آسمان پر گرد و غبار چڑھ رہا تھا۔ آندھی کے پورے آثار تھے۔

غفور کا توتا لوہے کے گول پنجرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ میر نہال کو دیکھتے ہی اپنے دانے کی کلھیا لڑھکا کر زور زور سے چیخا: "بولو میاں مٹھو، بولو" اور پھر ٹائیں ٹائیں کا شور مچانے لگا۔ ہر جگہ سکون محال تھا۔ میر نہال توتے پر بگڑ کے بولے:

"کمبخت تو بھی چین نہ لینے دے!" اور انگرکھا پہننے لگے توتے نے گردن موڑی اور گول گول دیدے پھرا کر اُن کو تیار ہوتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب انھوں نے پاؤں پٹخنے ہوئے باہر جانے کو پہلا قدم دہلیز پر رکھا تو توتے نے آدمیوں کی ہو بہو نقل اُتار کر قہقہہ لگایا اور بولا:

"الٰہی تیرا شکر" اتنے میں غفور آگیا اور ایک ہری مرچ اور چنے کی دال اس کی کلھیا میں ڈال دی جسے وہ ٹیں ٹیں کر کے کترتا رہا مگر آنکھیں پھیر پھیر کر دروازے کو دیکھتا جاتا تھا...

غفور نے اپنا حقہ تازہ کیا اور توتے کو نیا سبق پڑھانے لگا۔

۱۰

اصغر سے بلقلیس کی شادی اِس گھر میں اَنہونی اور عجوبہ بات تھی۔ یہ خبر دلچلن کے پیٹ میں نہ ٹھہری۔ سویرے سویرے مُسٹک سے کوٹھے پر پہنچ وہ ساری باتیں جو آندھی کے دوران بیگم نہال اور اُن کی بیٹی میں ہوئی تھیں، سب حرف بہ حرف جمال بیگم کو سُنا دیں۔

جمال بیگم کے دل میں کھدر بدر ہنڈیا سی پکنے لگی۔ کسی نوع وہ ساری حقیقت اپنی دیورانی سے قبلوانا چاہتی تھیں بھتیجے کی شادی سے تو انھیں کوئی سروکار نہ تھا اور نہ گھریلو معاملہ سمجھ کر ہی دلچسپی تھی۔ جو کچھ ان کو چلبلیک تھی وہ محض اس لیے کہ اشفاق کی شادی بھی جو اُن کا سگا بھتیجا تھا میر نہال کی مرضی کے بالکل خلاف شہباز مرزا کی بیٹی سے ہوئی تھی اور میر نہال اِس موقع پر بہت گرجے برسے تھے اور بھاوج کو کڑوی کسیلی سُنا کر بہت کچھ زہر اُگلا تھا جو اتنی مدّت گزرنے کے بعد بھی وہ نہ بھولی تھیں۔ اور اب تو بلّی کے بھاگوں چھینکا خود ہی ٹوٹ گیا تھا اور ان کو جلے پھپھولے پھوڑنے کا بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔ پھر کیوں نہ اُن کے دل

میں لڈّو پھوٹتے۔

شام کو وہ کوٹھے پر سے اتریں۔ خلافِ عادت بشاش نظر آرہی تھیں اور بیگم نہال کو پکارنے لگیں۔

"دلہن! اے بی دلہن! کہاں ہو؟"

"یہ رہی آپا جان!" بیگم نہال صحنچی میں بیٹھی ہوئی کنگھی چوٹی کر رہی تھیں۔

جمال بیگم نے چھوٹتے ہی کہا:

"مبارک ہو دلہن۔ اکیلے ہی اکیلے بات پکّی کرلی!"

بیگم نہال ہکّا بکّا ہوکر جمالی کو دیکھنے لگیں۔

"اے آپا کیسی بات۔ کس کی بات؟" انھوں نے پوچھا:

"اللہ رکھے اصغر کی اور کس کی؟"

"نہیں بی ابھی کہاں۔ خدا تمہاری زبان کا کہا کرے۔ بس اب تو ایک ہی ارمان ہے کہ اپنی آنکھوں سے اُس کی دلہن کی صورت دیکھ لوں اور وہ بھی میرے جیتے جی ٹھور ٹھکانے کا ہو جائے۔ میں مرگئی تو کہاں جینے میں چین لیے پھرے گا۔ مگر تم سے کس نے کہا؟"

"بھلا مجھ سے کون کہتا، نگلی ہونٹوں چڑھی کوٹھوں، دیکھ لو ہم کو بھی خبر ہو ہی گئی۔ اے بوا مجھ سے چھپانے کی کیا بات تھی۔ کیا تمہاری بہو کو اُڑا لوں گی؟" جمال بیگم نے طنزیہ کہا۔

"اے بی اُڑاؤ گی تو جب، جب بہو ہو گی۔ تمہاری تو وہی مثل ہے سوت نہ کپاس کولھو سے لٹھم لٹھا۔"

"بس بی ننھی نہ بنو۔ ہم ہی سے پردہ ہے۔ دُنیا زمانے میں ڈنکے پٹ جائیں، دلہن تمہاری یہی باتیں تو زہر لگتی ہیں۔ تو آج ہم کوئی تمہارے دشمن ہیں۔ اُئے جگ جگ جیو

جم جم بہاریں دیکھو۔ آنکھوں سُکھ کلیجہ ٹھنڈک۔"

"اے نام تو لو جس نے تم سے جھوٹ مُوٹ کی جڑ دی۔ اللہ جانتا ہے ابھی تو اصغر کا رقعہ بھی کہیں نہیں گیا۔ کہیں سُنا ہے بھتیجے کی بات ٹھہرے اور سگی تائی اماں کو خبر نہ ہو۔"

"خیر بی خیر چھوڑو۔ ہم کس گنتی شمار میں ہیں۔"

"آپا جان تو بہ ہے تم تو ایسے کچّے کانوں کی ہو گئیں۔ میرا یقین ہی نہیں آتا۔ کالا مُنہ جس نے کہا دل بُرے کروانے کو کہا۔ اور تم ہو کہ بیر باندھے جا رہی ہو..... اچھا لو پان تو کھا لو۔" بیگم نہال نے پاندان جٹھانی کی طرف بڑھا دیا۔

"اے کتھے کی کلھیا تو سوکھی پڑی ہے۔"

صحن میں مہرو مسرور کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ بیگم جمال وہیں سے بولیں:

"اوئی لڑکی دیدے کا پانی ڈھل گیا ہے۔ ہوائی گھوڑیوں کے سے کُدکڑے لگا رہی ہے۔ چل رے مسرور ذرا کٹورے میں پانی تو لا۔"

انھوں نے پانی پی کر کتھے میں ڈال دیا اور مسرور سے بولیں:

"تیری شامت آئی ہے؟ بڑی بہن سے مُنہ زوری کرتا ہے۔ جا، جا کر سبق یاد کر۔"

بیگم نہال چوٹی گوندھ چکی تھیں اور سفید بالوں کی لٹوں کو بل دے کر سُرخ موباف ڈال لیا تھا۔ بال تھتھکار کے اُگالدان میں ڈال دیئے اور کنگھی پر قل پڑھ کے تلے دانی میں لپیٹ کر رکھ دیا۔ جمال بیگم پھر کہنے لگیں:

"بوا تم لاکھ چھپاؤ میری تو دیکھی بھالی ہے۔ اللہ قسم دسوں انگلیاں دسوں چراغ ہے۔ ایسی کامنی سی بھولی بھالی گڑیا۔ صورت دیکھو تو جی چاہتا ہے دیکھے جاؤ۔ بلقیس اگر آ گئی تو گھر کو چار چاند لگ جائیں گے۔"

بیگم نہال سوچ رہی تھیں جب یہ راز خود ہی طشت از بام ہوگیا ہے تو جٹھانی سے بھی رائے لے لیں۔

"مگر دلہن!" جمال بیگم نے کہا "مجھے تو اچنبھا ہے بھائی نے مان کیسے لیا وہ اُن کی ہاتھ بھر کی اونچی ناک کہاں گئی۔ اشفاق نے مرزا شہباز بیگ کا داماد بن کر ناک کٹوا دی تھی، بیٹے کی جواب اُن ہی مُغلوں میں کر رہے ہیں۔ وہ خاندان، خون اور شرافت اب کدھر گئی؟ سچ کہا ہے کسی نے آسمان کا تھوکا منہ پر آتا ہے"

بیگم نہال خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئیں، کوئی اور وقت ہوتا تو شاید پلٹ کر سُنا دیتیں مگر اِس وقت تو اُنھیں کی گئی دَب رہی تھی۔ ویسے بھی جمال بیگم کی کڑوی کسیلی باتوں کے لوگ عادی ہو گئے تھے۔ اور ان کا کہنا بھی جھوٹ نہ تھا۔ اِس لیے بیگم نہال نے کہا:

"اے گڑے مُردے اُکھیڑنے سے کیا فائدہ، جو ہونی تھی سو ہو چکی۔ اُن کا بڑا بول اُنہی کے سامنے آیا اور تُو اشفاق کی شادی کے جب خلاف تھے تو اب کون سے اصغر کے لیے راضی ہو گئے۔ بلعتیں سے خیال تھا مگر تمہارے دیور نے صاف انکار کر دیا۔ ایک دو دفعہ میں نے یوں ہی ذکر چھیڑا۔ لے بیوی وہ تو پنجے جھاڑ کر میرے ہی پیچھے پڑ گئے۔ وہ تو جھوٹوں بھی اِس بات کو سُننے کے روادار نہیں۔ ان کی زبان پر تو ایک نہیں کے سوا دوسری بات ہی نہیں۔ کہتے ہیں یہ رشتہ ہو گیا تو اصغر کو عاق کر دوں گا۔ مرتے دم تک شکل بھی نہ دیکھوں گا"۔ بیگم نہال نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ اس وقت ملال اور مایوسی اُن کے چہرے سے ٹپکی پڑتی تھی۔

جمال بیگم دیورانی کی بات کو کان دھر کے سُن رہی تھیں اور اپنے شکوے اور طعنے بھول گئیں اور خاندانی الجھاؤ کے اس پیچیدہ معاملہ میں ان کو دلچسپی ہو گئی۔

زبان کی بُری سہی پَر وہ دل اور طبیعت کی اتنی بُری نہ تھیں، اور دیورانی کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا:

"لو تم دل میلا نہ کرو۔ کیا مجھے میاں نہال کا مزاج معلوم نہیں۔ ان کا ہمیشہ سے یہی وطیرہ ہے۔ اپنے آگے وہ کسی کی سُنتے ہی نہیں۔ تم اُن کے اقرار انکار کے بھروسے رہیں تو وہ قیامت تک راضی نہ ہوں گے، بس تم بہو کا ارمان لیے بیٹھی رہنا۔ تم کہو گی اشفاق کی سالی ہے اس لیے تعریفوں کے پُل باندھ رہی ہوں۔ مگر لڑکی خدا کی قسم لاکھوں میں ایک ہے۔ دبی دبائی۔ موئی آجکل کی لڑکیوں کی طرح نہیں کہ لونگ چڑا بنی پھرتی ہیں، چلیں تو سترگھر ہلیں۔ اس کی ننھیال میں سے کئی پیغام آچکے ہیں۔ مگر شہباز دلہن نے کوئی جواب نہیں دیا ہے۔"
بیگم نہال نے جواب دیا:

"لے بی پرائی چیز اچھی ہے تو ہمیں کیا۔ ہاں اپنی ہو جائے تو کوئی بات ہے۔"
"اب لڑکی ہوا میں اُڑ کر تمہاری گود میں تو آنے سے رہی۔ بی بہو لانے میں جوتیاں توڑنی پڑتی ہیں۔ تمہارے واسطے اللہ بخشے اماں بی نے دہلیز کی مٹی لے ڈالی تھی۔"

"بی میں تو سر کے بل لڑکی کے گھر جاؤں۔ مگر اصغر کے ابا کا میں کیا کروں؟ اپنی تو وہی کہانی ہے چپ رہوں باوا کتا کھائے بولوں تو ماں ماری جائے۔ باپ کا غصہ ناک پر دھرا ہے اور بیٹے کی جان ہتھیلی پر۔ میری تو عقل دنگ ہے دونوں کی ضد نے باولا کر دیا۔ توبہ ہے زندگی بتنگ ہوگئی۔"

"بی، تم اللہ رکھے پوتا پوتی والی ہوگئیں مگر ہو اللہ میاں کی گائے۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے کہیں کام بنے ہیں؟"

"تو کیا کروں؟ مجھے تو اُن کے خفا ہونے کا ڈر ہے۔ میاں کو ناراض

کر کے نامۂ اعمال میں گناہ لکھواؤں اور دوزخ سمیٹوں؟ ہاتھا پائی کرنے سے تو رہی یا کہو تو روٹھ کر میکے جا بیٹھوں۔ مگر ان باتوں سے وہ کوئی مانیں گے؟"

"اے یہ کون کہتا ہے۔ خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا۔ ایک کیا لاکھوں حیلے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ شاباش ہے تمہاری ہمت کو کہ نیچے کی تو جان کے لالے پڑ رہے ہیں اور تم میاں کے تیور دیکھ رہی ہو غضب خدا کا۔ غصہ نہ ہوا ہوا ہو گیا جو تم کو کھا جائے گا۔ مرد کے غصے کا کیا ہے کڑھی کا سا ابال ہوتا ہے۔ چاہیے کہ کھو جلے پر خصم راضی رہے۔ اے بی دلہن ہوش کی دوا کرو۔"

"اچھی پھر تم ہی تدبیر بتاؤ نا!"

"لو کر دی کیا۔ اللہ کا نام لے کر بات پکی کر کے رکھ لو۔ مرزا جی کوئی اپنی بیٹیا کو تمہارے نام پر بٹھائے تو نہ رکھیں گے۔ جوان بیٹی سب پر بھاری ہوتی ہے اس وقت میاں کی اجازت کی ضرورت تھوڑی ہے۔ ابھی کون سی اینٹیں لے کر وداع کروا

"امّاں یہ مُرادن ڈومنی کس دن کام آئے گی؟ اس کے ہاتھ رُقعہ بھجوا دو۔"

"نہیں بی۔ موئی مشاطہ ڈومنیوں کی بات ایسی ہی ہوتی ہے۔ کہیں رنگ میں بھنگ نہ کریں۔ میں تو خود ہی جاؤں گی۔ آج بدھ ہے انشاء اللہ جمعہ کو ٹھیک رہے گا۔ کیوں آپا جان، ہے نا؟"

بیگم جمال بولیں:

"ہاں۔ خدا تمہیں چاند سی بہو لانا نصیب کرے۔ خوش رہو۔ پھلو پھولو..."

آج بہت دنوں کے بعد ماں بیٹیوں کی آنکھیں خوشی سے مسکرا رہی تھیں۔

١١

اصغر کو ضبطِ شوق کا یارا تھا نہ غمِ فراق کی تاب۔ وہ تھا اور اُس کا دلِ ناصبور۔ صبر و شکیب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ کر مایوسیاں بڑھ گئی تھیں۔ کبھی اس کو قسمت کا گلہ ہوتا کبھی خود پر تاسف۔ مگر وہ آگ جو اس کے سینے میں پیہم سلگ رہی تھی کسی صورت دھیمی نہ پڑتی۔ کھانا برائے نام رہ گیا، نیند کی کمی سے آنکھوں میں سُرخ ڈورے پڑ گئے، چہرہ سُت کر سیپ سا نکل آیا۔ اس کا جی کہیں نہ بہلتا بندو کے پاس جا کر وہ اور گھبراتا اور وہاں سے اُٹھ کر وہ باری کے ہاں چلا جاتا پر کسک اور بیقراریاں وہی رہتیں۔

ایک دن اُس کو چُپ دیکھ کر باری نے کہا:

"کہو کیا حال ہے پیارے؟ بڑی رونی صورت بنا رکھی ہے۔"

اصغر نے بڑی خشکی سے جواب دیا:

"ارے ہم قسمت کے ماروں کا نہ پوچھو۔ ہم تو روزِ ازل سے تقدیر ہی اُلٹی لے کر آئے ہیں۔"

باری نے ایک قہقہہ لگایا اور اصغر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا:

"اُناں ڈور دز کی عاشقی نے میاں جی کی چوکڑی بھلادی۔ ابھی سے دل چھوڑ بیٹھے۔ وہ کیا خوب کسی نے کہا ہے:

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا

عاشقوں کو لوہے کے چنے چبانے پڑتے ہیں۔ جاؤ بھی یار تم نے تو عاشقوں کی ناک جڑ سے کٹوا دی!"

مگر اصغر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اس وقت در حقیقت وہ بہت آزردہ ہو رہا تھا۔ باری بھی بڑی ہمدردی سے اس کی دل دہی کرنے لگا۔

"دیکھو یار! میرا دل کہتا ہے کہ انجام بخیر ہوگا۔ کبھی یاروں کا کہا بھی مان لیا کرو۔ اٹھوائی کھٹوائی چھوڑو شہزادے، کال کوٹھری میں کب تک پڑے رہو گے یار خاں تو جیو ہتیا کے قائل نہیں۔ چلو اٹھو ذرا باہر چل کر دنیا اور دنیا کے رنگ دیکھو۔ دل بہلاؤ۔ جوانی گئی زندگانی گئی......"

اصغر بہتیرا انہیں نہیں کرتا رہا مگر باری اس کو زبردستی مشتری بائی کے ہاں لے ہی گیا۔ گرمی زیادہ ہو رہی تھی۔ لو کا جھونکا کبھی کبھار آجاتا تھا تو اور جھلسا کر چلا جاتا۔ آسمان پر گرد و غبار چڑھا ہوا تھا ماہتاب کا چہرہ سورج مکھی کے پھول کی طرح زرد اور مضمحل تھا۔ زعفرانی چاندنی خاک کے باریک ذرّوں میں سے چھن چھن کر درماندہ دنیا پر پڑ رہی تھی۔ تاریک گلیوں اور راہ گزاروں پر محوِ خواب عمارتوں کے سائے پھیکی پھیکی روشنی میں اور پُراسرار معلوم ہو رہے تھے۔

فقیر ابھی تک دروازوں پر کھڑے اور سڑکوں کے کنارے بیٹھے ہوئے صدائیں

دے رہے تھے۔ کہیں کہیں پھول والوں کی لہکار سنائی دیتی تھی اور کبھی کبھار کسی سنسان
گلی کے اندھیرے گوشے سے ساقی نکل آتے تھے اور کوئی تشنہ لب ایک دو دم لگاکر
رخصت ہو جاتا۔ ایک آدھ بے فکری سے بیٹھ کر کش پہ کش لگاتا اور دھوئیں کے بادل
فضا میں چھوڑ دیتا۔ تمباکو کی بو ہوا میں پھیلتی اور دہکتی ہوئی چنگاریاں چلم سے اڑ کر
زمین پر گرتیں اور بجھ جاتیں کوئی بہت ہی دل والا ہوا تو ایک آدھ پیسہ ازراہِ ہمدردی
ساقی کو عنایت کر دیتا ورنہ اکثر نشے باز طلب بجھاتے اور بغیر کچھ دیئے ہی روانہ ہو جاتے
مگر ساقی کے لبوں پر حرفِ شکایت کبھی نہ آتا۔

وہ چاوڑی میں سے گزر رہے تھے۔ دونوں طرف کسبیوں کی دکانیں تھیں جو
اس وقت بند ہو چکی تھیں۔ بازارِ حسن و عشق بھی یہیں تھا۔ گو سڑک تنگ تھی لیکن

چونکہ مشتری بائی ڈیرے دارنی تھی۔ لہٰذا عام اور پیشہ ور رنڈیوں کی طرح کوٹھوں پر نہ بیٹھتی تھی بلکہ چاوڑی کے عقب میں اس کا مکان تھا۔ اصغر اور باری اس کی گلی میں مڑ گئے۔ اس وقت گلی بالکل سنسان تھی جہاں صرف پھیکی پھیکی چاندنی آرہی تھی۔ ایک مکان کی چھت پر دو بلّیاں غرّاتے غرّاتے وحشتناک آواز سے میاؤں میاؤں کر کے لڑنے لگیں۔ ایک شخص دل گداز آواز میں گاتا ہوا ان کے قریب سے گزرتا چلا گیا:

کیا مجھ کو داغوں نے سروِ چراغاں
کبھی تو نے آکر تماشا نہ دیکھا...

مشتری بائی کا گھر آ گیا تھا۔ زینے کے طاقچے میں مٹی کا دیا ٹمٹم جل رہا تھا۔ ننھی سی لَو لرز لرز کر اپنے چاروں طرف اُجالا پھینک رہی تھی مگر اس کی میٹھی میٹھی روشنی میں اندھیری سیڑھیاں اچھی طرح نظر نہیں آتی تھیں۔

اصغر اور باری سنبھل سنبھل کر اوپر چڑھنے لگے۔ چڑھتے ہوئے اصغر کو خیال آیا کہ وہ زمانہ کس قدر طرب انگیز تھا جب اس میں اور مشتری میں باہم رسم و راہ تھی۔ اُن ٹُرکیف ملاقاتوں میں نہ یہ رنج تھے نہ یہ آلام۔ اب تو دنیا غاروں کی طرح تاریک اور بے پایاں تھی اور زندگی دشوار۔ جب وہ انگنائی میں پہنچے تو مشتری بائی بے خیال پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ انھیں دیکھتے ہی اُٹھ کر بیٹھ گئی اور آداب بجالائی۔ اصغر نے سلام کا جواب دے تو دیا مگر نہ معلوم کیوں مشتری بائی کو دیکھ کر اسے اپنی تنہائی کا شدید احساس ہونے لگا۔

مشتری بائی انھیں کمرے میں لے آئی۔ اس کے چہرے پر متانت اور نرمی تھی۔ بظاہر وہ بہت شریف اور باعزت معلوم ہوتی تھی۔ حُسن کسی بناوٹ کا رہینِ منت نہ تھا۔ اس کی وہ کٹورا سی آنکھیں سیاہ اور چمکیلی تھیں اور ان کے متوالے پن

میں ناگن کا سا بس بھرا تھا جو قلب و جگر میں سرایت کر جائے۔ لباس کی سادگی اس کی طبیعت کی نفاست اور ذوق سلیم کی غمازی کر رہی تھی۔ آڑے پیجامے پر چکن کا کرتہ تھا اور کلف دار چُنا ہوا ململ کا گلابی دوپٹہ جس میں کہیں کہیں ابرق کے ذرّے لالٹین کی روشنی میں جھمک جاتے۔ ہاتھوں میں سونے کے نقشین کنگن پڑے تھے اور بالیاں موتیا کے تازے تازے پھولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ناک سبک اور ستواں تھی جس میں ہیرے کی لونگ ستارے کی طرح جگر جگر کر رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی رچی ہوئی تھی اور خس کے عطر کی ہلکی ہلکی لپٹیں آ رہی تھیں۔

بیٹھتے ہی وہ اصغر سے مخاطب ہوئی:

"صاحب آپ تو عید کا چاند ہو گئے۔ عبث نگاہیں دید کو ترستی ہیں۔"

اصغر نے بے رُخی سے کہا:

"آپ میری تیرہ بختی سے لاعلم ہیں۔ خطا وار ہوں۔ جو مزاجِ یار میں آئے۔"

مشتری بائی اصغر کی سرد مہری سے کچھ بجھ سی گئی مگر اس نے بڑے خلوص سے کہا:

"مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔ دنیا اسی کا نام ہے۔ بے غرض کون کسی سے ملتا ہے پھر مجھ غریب بندی کو بھلا کوئی کیوں نوازنے گا؟"

"خوب۔ ہے ہے یہ تو چاہنے والوں کے جگرے سے پوچھو۔" باری نے کہا، "اللہ اللہ یہ موہنی صورت، یہ دولت، یہ جوانی اللہ نے سب ہی کچھ تو دے رکھا ہے۔ ناشکری نہ کرو۔ ایک عورت کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیے۔ بی جان! تم بھی نری نادان ہو۔"

"سرکار تسلیم کرتی ہوں۔ اس وقت میرے پاس سب دولتیں ہیں لیکن حسن و شباب بے اعتبار ہیں۔ رُت بدلتی رہتی ہے۔ ایک دن خزاں آئے گی، عہدِ جوانی

رخصت ہو جائے گا اور بہارِ حسن پامال۔ پاکیزگی نکہت ہی حسن لازوال ہے اور متاعِ بے بہا اور بندی اس سے محروم ہے۔" اس نے بڑی حسرت سے باری کو جواب دیا اور خاموشی سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

اصغر نے مشتری بائی کو خلافِ معمول بہت سنجیدہ اور ملول دیکھ کر منطقیوں کی طرح کہا:

"حُسنِ جسمانی ہی دراصل حسن و شباب ہے، ایک ایسا گلاب جو رنگ و روپ کی موہ مایا کا جال پھیلا کر دلِ بلبل کو محسور کر لیتا ہے اور جب بلبل وارفتہ ہو جاتے ہیں تو اپنی جور و جفا سے ان کے دل مجروح اور جگر چاک کر دیتا ہے جس طرح ایک شمع اُنہی پروانوں کو جلا دیتی ہے جو اس پر نثار ہونے آتے ہیں۔"

مشتری بائی نے اصغر کو عجب انداز سے دیکھا۔ اس دیکھنے میں ناکام تمنّا بھی تھی اور کملتی محبت بھی۔

"نہیں صاحب۔ بھلا گل کی رعنائیوں میں وہ حسن کہاں جو اس کی خوشبو میں میں پنہاں ہے؟ میں تو ایک بکسی ہوئی کلی ہوں جس میں نہ بو ہے نہ باس۔ جو ویرانوں میں کھلی اور کُمھلا گئی، جس پر کسی کی نگاہِ غلط انداز بھی نہ پڑی۔ یا وہ شمع سوزاں ہوں جو تنہا اپنی آتش میں خود ہی جل جاتی ہے۔ بجھتی ہے تو دھواں اٹھتا ہے جو طاق و محراب کو بھی سیاہ کر کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیلا دیتا ہے۔ میرا نہ کوئی ہمدم نہ چارہ ساز ہے بندہ پرور۔ یقین کیجیے کبھی کبھی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں صحرا کی اس سرائے کی طرح ہوں جہاں مسافر آتے ہیں، اپنی تھکن مٹاتے ہیں اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی اپنی منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔"

اصغر نے پھر فلسفہ آرائی کرتے ہوئے کہا:

"تم کو اپنے متعلق یہ غلط خیال کیوں ہوا؟ تم تو وہ نخلستان ہو نظر جس کی

جستجو کرتی ہے، اور سبز منزل کا وہ روشن چراغ جو بھولے بھٹکوں کو گم شدہ راہ کا پتہ بتاتا ہے۔"

مشتری بائی نے ٹھنڈا سانس بھرا:

"نہیں، مجھے فریب نہ دیجئے۔ میری زندگی کی اصلیت یہ ہے جہاں نہ سبزہ ہے نہ شادابی۔ دور دور لق و دق ویران ریگزار پھیلا ہوا ہے، حقیقت کچھ بھی نہیں سراب ہی سراب ہے، نہ جادہ ہے نہ منزل نہ چراغ۔ جو خود تاریک ہو وہ کیا کسی کی رہنمائی کرے گا۔ یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔ یہ عاجز مشکور و ممنون ہے مگر مجھے اپنے متعلق کسی قسم کا مغالطہ نہیں ہے۔ اور اگر یہ خوبیاں مجھ میں موجود ہوتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ میں تو آپ کو بھی اپنا نہ بنا سکی۔" اس کا لہجہ مایوسانہ تھا.....

بارہی کو اصغر اور مشتری بائی کی حملے بازیوں سے کوفت ہو رہی تھی۔ آخر اس

وہ جو ملتے تھے کبھی مُنہ سے مُنہ کبھی لب سے لب کبھی دل سے دل
مجھے ان پہ جتنا غرور تھا میرے سب غروروں کو ڈھا گئے

میرے ساتھ رہتے تھے دم بدم وہ جدا نہ ہوتے تھے ایکدم
یہ دکھایا چرخ نے کیا ستم وہ مجھ ہی سے آنکھ چرا گئے

ہے اب یہ اپنی دُعا کہ دل کسی بے وفا پہ نہ آئے دل
کہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

اصغر نے آکر مشتری بائی کے جذبات کو چھیڑ دیا تھا۔ دردِ نہاں بڑھ کر کسک دینے لگا۔ اس کی آوا نجذبات سے ہم آہنگ ہوگئی اور وہ سوز و کیفِ غم سے مغلوب ہوکر گاتی رہی۔ ہر اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اصغر کا دل بھی ڈوبتا اور اُبھرتا تھا۔ ایک نا معلوم خلش تھی جو اُس کے دل کو دُکھا رہی تھی اور وہ تصویرِ یاس بنا ہوا گانا سنتا رہا۔ مشتری بائی نے جب غزل ختم کی تو باری کہنے لگا:

"واہ! واہ!! واللہ جی خوش ہوگیا۔"

اصغر نے بھی داد دی اور وہ مجرا بجا لائی۔ پھر اصغر باہر دیکھنے لگا آسمان پر چاند چمک رہا تھا اور سنہری سنہری کرنوں نے اس کے گرد ہالہ بنا رکھا تھا۔ قرمزی حلقے کے بعد نیلا پھر اودا اور سبز حلقہ تھا اور پورا ہالہ زرنگار ہوکر قوس و قزح کی طرح رنگین اور بے حد حسین نظر آرہا تھا۔ چاند کو دیکھتے دیکھتے اصغر کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی محبت بھی چاند کے ہالے کی طرح ہے جس نے اس کی معشوقہ کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے اور شوق و ولولے نے محبت کے ہالے کو رنگین بنا دیا ہے۔ پان بناتے بناتے مشتری بائی کی نگاہ بھی آسمان پر پڑی اور زرد چاند کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کہنے لگی "میری ناکام محبت کا سایہ کیا تجھ پر بھی پڑ گیا جو تو بھی میری طرح سوگوار ہے؟"
گلوریاں بنا کر مشتری بائی نے خاصدان اصغر کو پیش کیا۔ باری کلا بتّو کی

ٹوپی اوڑھے بالکل مہاتما بدھ کی طرح آسن جمائے بیٹھا ہوا تھا، اور ایک ہاتھ سے پاؤں کا تلوا برابر سہلا رہا تھا۔ مشتری بائی نے اس کی طرف گلوری بڑھائی۔ جب اس نے لینے کو ہاتھ بڑھایا تو اس کی ہتھیلی میں گول چاند اور چھنگلیا کی پور مہندی سے سرخ نظر آئی۔ اس کے چہرہ پر سختی تھی اور آنکھوں کی زائد سفیدی اس کے عیاش ہونے کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ مشتری بائی کی طرف جھکتے ہوئے معنی خیز طریقہ سے بولا:

"خدا کی قسم آج تم پر بلا کا جوبن ہے۔ کہیں پیاروں کی نظر نہ لگ جائے۔"

مشتری بائی لاکھ رنڈی سہی، تھی عورت۔ بارہی سے بے باک تعریف سن کر اس کے عارض فطری حیا کی سرخی سے دہک اٹھے اور اس نے یہ شعر پڑھا:

ہم مسافر ہیں بس ہماری حیات کیسی ممات کیسی
بجھا دیا تھا تو بجھ گئے تھے جلا دیا ہے تو جل رہے ہیں

اس میں شک نہیں کہ وہ بھی زمانہ تھا جب اصغر کی مشتری بائی سے رسم و راہ تھی اور کبھی وہ اس کا عاشقِ زار تھا۔ لیکن یہ محبت وہی تھی جو ایک مرد کو کوٹھے پر جانے کے بعد ایک طوائف سے ہو جاتی ہے۔ اور اب تو وہ رنگین جوش و خروش بھی ختم ہو چکا تھا اور وہ عشق و عاشقی کے طوفان اتر چکے تھے اور اس وقت مشتری کا قرب، اس کی مانوس آواز، ادائیں اور اس کا سراپا اسی موہوم ماضی کو بار بار یاد دلا رہا تھا، اور مشتری بائی کا یوں آہیں بھر بھر کر شعر پڑھنا اور بر ملا شکوے کرنے اصغر کو پھانس کی طرح کھٹک رہے تھے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ مشتری بائی کے موجودہ رنج و غم اور غمگینی کا باعث دراصل اس کی ذات ہے اور شعور کی پنہائیوں میں چھپی ہوئی اس حقیقت سے خجل ہو ہو کر جھنجھلا رہا تھا۔ چنانچہ اب جب کہ اس کو کوئی تھوڑا سا لگاؤ بھی باقی نہیں رہا تھا تو مشتری بائی کو اپنی چاہت جتانے کا کیا

حق تھا؟ اصغر بیزار ہو کر جانے کو اُٹھا تو مشتری بائی نے پوچھا:

"سرکار ہم سے خفا کیوں ہیں؟"

"خفا کون ہے؟"

باری نے طنزاً کہا:

"جنابِ والا دردِ دل کے مریض ہو گئے ہیں۔"

اصغر کو اس جملہ پر طیش آ گیا اور ترش رُوئی سے کہنے لگا:

"دل لگی مت کرو۔ بیکار باتوں سے کیا حاصل۔"

اصغر کی خفگی سے مشتری بائی کے پندارِ عشق کو ٹھیس لگی اور اس کا مُنہ ذرا سا نکل آیا مگر اُس نے کمالِ مشاقی سے اپنے جذبات پر قابو پا لیا جس کی تعلیم ایک طوائف کو بچپن سے ملتی ہے اور بات کو ہنسی میں اُڑاتے ہوئے بولی:

"مار کٹاری مر جانا، دل نہ کسی سے لگانا...." اور یہ کہتے ہوئے انھیں رخصت کرنے کے لیے دروازہ تک آئی۔

رات ایک پہر گزر چکی تھی اور شہر میں سناٹا ہو گیا تھا۔ درختوں کے سائے چاندکی نقرئی روشنی میں لمبے لمبے ہو کر سنسان سڑکوں پر پڑ رہے تھے۔ چاوڑی کے کسی کوٹھے سے ابھی تک گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں اور ایک آدھ تماشبیں چوروں کی طرح دبے پاؤں نیم تاریک زینوں سے اُترتا دکھائی دیتا تھا۔ کتے جا بجا گندگی کو سونگھتے پھر رہے تھے۔ گلیوں میں آبخوروں کے ٹھیکرے مٹھائی کے جھوٹے دونے اور مکانوں کے اندر سے پھینکا ہوا سڑا کھسا کھانا اور ترکاری کے چھلکوں کی ڈھیریاں جگہ جگہ پڑی تھیں جن پر بلیاں قبضہ کیے بیٹھی ایک دوسرے پر دھونس جما رہی تھیں اور غصہ میں عجیب عجیب بے ہنگم آوازیں نکال رہی تھیں جن سے دل اُوبا جاتا تھا۔

جب اصغر حوض قاضی پر پہنچا تو ایک سن رسیدہ شخص اجمیری دروازہ کی طرف سے نکلا اور اصغر کے آگے آگے چلنے لگا۔

اصغر اپنے خیالوں میں مست چھڑی کو گھماتا ہوا اطمینان سے جا رہا تھا۔ بڑے میاں اچانک اصغر کا راستہ کاٹتے ہوئے ایک گلی میں مڑے۔ اتفاق سے اصغر کی چھڑی ان کے بے جگہ لگ گئی۔ بڑے میاں فوراً پلٹے اور بولے:

"میں نے کہا، چاند ڈُو لیا ہمیں سے ہے"

ایک ہیجڑا جو ابھی تک ایک گوکھ میں کسی بھولے بھٹکے پنچھی کی آس لگائے بیٹھا تھا یہ تماشہ دیکھ کر زور زور سے تالیاں بجانے اور بے اختیار قہقہے لگانے لگا۔ اس وقت اصغر خود شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔ بڑے میاں کا فقرہ کچھ ایسا چست ہوا تھا کہ جواب نہ بن پڑا اور وہ گردن جھکا کر تیزی سے آگے بڑھ گیا

۱۲

گھر کے سب لوگ سو چکے تھے، صرف وحیدہ بیگم، اصغر کے انتظار میں جاگ رہی تھیں۔ اصغر پنجوں کے بل گھر میں آیا اور جب صحن میں پہنچا تو اس کی نگاہیں کھجور کے درخت پر پڑیں اور اس کے بدصورت اور کالے سیاہ ننھے کے ساتھ ساتھ اُٹھتی ہوئی آسمان تک چلی گئیں۔ آسمان پر چاند روشن تھا اور ہلکی ہلکی سبز چاندنی میں ہر چیز محوِ خواب تھی۔ کھجور کے پتوں کی اوٹ سے بنات النعش کا سب سے بڑا ستارہ جگر جگر کرتا جھانک رہا تھا۔ اصغر کو نہ معلوم کیوں وہ حکایت یاد آ گئی کہ باپ کی لاش پلنگ پر پڑی ہوئی ہے اور تینوں بیٹیاں باری باری پلنگ کی کان نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایک پایہ سیدھا کرنا چاہتی ہیں تو دوسرا پایا ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ اصغر نے دل میں کہا اپنی زندگی کا بھی یہی ڈھب ہے۔ ایک کام بنتا ہے تو دوسرا بگڑ جاتا ہے۔ وہ یہی سوچتا ہوا اوپر چلا گیا۔ ہوا بالکل بند تھی، سارے پتے ساکت تھے اور کھجور کا پُرانا درخت بھی خاموشی سے ہوا کی آس لگائے آسمان کی طرف مُنہ اٹھائے کھڑا تھا۔

وحیدہ بیگم بھی اصغر کے پیچھے کوٹھے پر آ گئیں۔ اصغر نے ایک عالمِ محویت سے چونک کر کہا:

"آپ ابھی تک نہیں سوئیں؟ کیوں کیا بات ہوئی؟"

"ہاں میں تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔"

"کوئی خاص بات تھی؟" اصغر نے سوال کیا۔

"نہیں بھئی خاص بات کیا ہوتی۔ میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ اماں نے ابا سے بات کی تھی۔"

امید و بیم سے اصغر کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس نے ہمہ تن شوق ہو کر پوچھا:

"پھر ابا کیا بولے؟"

"بھیا وہ تو یہ تجویز سنتے ہی کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے۔"

اصغر نے سرد آہ بھری اور آسمان کو مایوسی سے دیکھا، چاند کا چہرہ خاک کے پردے میں چھپ کر زرد پڑ چکا تھا۔ وہ قوس و قزح جیسا رنگین ہالہ معدوم ہو گیا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ چاند بھی تھوڑی دیر کا مہمان ہے جو خاک کے پردوں میں روپوش ہو جائے گا۔

اصغر نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اس کی آنکھیں موٹے موٹے آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ "کاش اس زندگی کو موت آ جائے۔" اُس نے درد بھرے لہجہ میں کہا۔

وحیدہ بیگم اس کی بات کاٹتے ہوئے بولیں:

"اے لوج، تمہارے دشمنوں کو آئے۔ اماں تو تمہاری پشتی لے رہی ہیں، سب کچھ بھگتنے کو تیار رہیں، پھر تم کیوں بے بات ہراساں ہوئے جاتے ہو۔

ابا کو ضد چڑھ گئی ہے۔ وہ بھی انشاءاللہ دیر سویر مان ہی لیں گے۔ ہمت ہارنے کی نوبت نہیں آئی ہے ابھی۔" اور کا پروہ بشاشی سے کہنے لگیں: "مٹھائی کا وعدہ کرو تو ایک بات کہوں تم سے۔"

"پہلے کہیے مٹھائی بھی آجائے گی۔"

"امّاں جمعہ کو شہباز بیگ کے ہاں تمہارا پیام لے کر جانے والی ہیں۔ خدا کرے وہ قبول کرلیں۔ ابا کو ابھی اس کی خبر نہیں ہے۔ ان کا کیا ہے دیکھا جائے گا۔ وہ خوشی کی گھڑی تو آئے ہم ان کو بھی منالیں گے۔"

پڑوس میں ایک مرغے نے پر پھڑپھڑا کر زور سے بانگ دی۔ اصغر نے سر اٹھا کر وحیدہ بیگم کو دیکھا۔ اس کا چہرہ امید و آرزو سے دمک اٹھا اور وہ غیر متوقع خوشی میں بہن سے لپٹ گیا۔

"آپا تم نہ آتیں تو سچ مچ کچھ نہ ہوتا۔"

"میں کیا اور میری بساط کیا۔ کرنے والا اللہ ہے۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور تمہارے سہرے کے پھول کھلیں۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر دونوں بہن بھائی خاموش بیٹھے رہے، پھر وحیدہ بیگم کہنے لگیں:

"اب تو بس تم میرے ساتھ بھوپال چلے چلو۔ یہاں تم کو دیکھ دیکھ کر ابا کو بلاوجہ غصہ آئے گا اور تم کو سخت سست کہیں گے اور تم کڑھتے رہو گے۔ تمہاری غیر موجودگی میں امّاں چولیں خود ہی ٹھیک بٹھالیں گی اور شادی ہوتے ہوتے سال بھر تو ویسے لگ ہی جائے گا۔"

اصغر ان کی رائے سے متفق ہو گیا اور وحیدہ بیگم نیچے چلی گئیں۔ آج دنیا کس قدر پُرامن ہو گئی تھی، اور وہ مگن ہو کر لیٹ گیا۔ اس وقت اس کو افسوس

ہو رہا تھا کہ کیوں مشتری بائی کا دل اُس نے اپنی باتوں سے دُکھایا۔ کیا تھا اگر کچھ دیر اور اُس کے اصرار پر وہاں ٹھہر جاتا۔ پھر وہ خوابوں کے حسین شیش محل بنانے لگا۔ ہجوم در ہجوم مُسرتیں چلی آرہی تھیں اور ان مسرّتوں میں بلقیس کا پُرفریب خیال جلوہ گر تھا۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جمعے والے روز بیگم نہال اپنی جیٹھانی کو ساتھ لے کر مرزا شہباز بیگ کے گھر اصغر کا پیغام لے کر پہنچیں۔ مرزا جی کی بیوی نے بڑے تپاک سے اُن کا خیر مقدم کیا اور بہت خاطر تواضع سے پیش آئیں۔ بیگم نہال کے سوال پر کہنے لگیں بہن ایک دو روز میں لڑکی کے ابا سے پوچھ کر کہلوا دوں گی۔

مرزا شہباز بیگ کو ایسا لائق فائق اور ہونہار داماد چراغ لے کر بھی ڈھونڈتے تو کہاں نصیب ہوتا۔ ان کی جھولی تو بن مانگے اللہ نے موتیوں سے گھر بیٹھے بھر دی تھی۔ اور سنہری چڑیا جب خود ہی دانے پر گری تھی تو بھلا وہ کیوں پھُر ہونے دیتے اور بلا ردّ و کد کے پیغام فوراً قبول کر لیا۔

بلقیس والوں کی طرف سے ہاں ہوتے ہی بیگم نہال کو جیسے کھوئی ہوئی جنّت مِل گئی ہو، اور اس خوشی میں دوسرے ہی دن مولود شریف کروایا۔ سارا گھر جھڑا جھا۔ سفید براق چاندنیاں بچھیں۔ بڑے دالان کے بیچ میں چوکی رکھی گئی اس پر سوزنی بچھا کر گاؤ تکیے لگا دیے گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر میں فتیل سوز اور شمع دان روشن ہوئے۔ چاندی کی اگر دانیوں میں اگر بتیاں جلائی گئیں، لوبان دانی میں لوبان سُلگا۔ گلاب پاش میں گلاب بھرا گیا اور چنگیری میں موتیا کے تازے تازے پھول رکھے گئے۔ لوبان اور اگر کا معطر دھواں بل کھاتا ہوا آہستہ آہستہ موتیا کی خوشبو میں مِل کر اوپر اٹھ رہا تھا اور پھر لہرا کر سارے میں پھیل جاتا۔

ایک رُوح افزا خوشبو ہوا میں بس گئی۔ در و دیوار مہکنے لگے اور دل فرطِ عقیدت سے معمور ہو گئے۔ گھر کے سب لوگ میلاد شروع ہونے کے منتظر بیٹھے تھے۔

اصغر نے بڑی خوش الحانی سے قرآن شریف کی تلاوت کی۔ اور اس کے بعد سرورِ دوعالم احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ بیان کی ان کی ذات اقدس تمام بنی نوع انسان کے لیے رحمت اللعالمین تھی۔ آپ کے معجزے بیان کیے جب سلام پڑھنے کا وقت آیا تو سب کھڑے ہو گئے۔ شمس اور مسرور بھی اصغر کے ساتھ شریک ہو کر سلام پڑھنے لگے۔ عالمِ کیف میں اصغر جھوم جھوم کر یا حبیب سلام علیک کہتا اور اس کی آواز رات کے سناٹے میں دُور دراز تک پہنچ جاتی۔ اس کا دماغ لوبان اور اگر کی خوشبو سے معطر تھا اور اس کا دل خدا کی عظمت اور اسلام کے جوش سے لبریز سننے والوں پر رقّت طاری تھی اور وہ سر جھکائے مؤدب کھڑے تھے۔ کچھ بڑی بوڑھیاں عشقِ محمدیؐ میں رو رہی تھیں اور ان کی ٹھوڑیوں پر آنسوؤں کے قطرے لرزیدہ تھے۔ جب محمدؐ کا نام آتا تو سب تعظیماً انگوٹھے چوم چوم کر اپنی آنکھوں سے لگاتے۔ مسرور نے سب سامعین پر گلاب چھڑکا اور مجید نے سب کی پیشانیوں پر حنا کا عطر ملا۔ زمین سے آسمان تک تقدیس کا عالم تھا۔ فضا معطر تھی اور غبار چھٹ کر روح مصفا ہو گئی تھی۔ سب کے دلوں میں اس وقت صرف اللہ اور اس کے حبیب کا عشق موجزن تھا اور وہ فردوس کے ان وعدوں کے خواب دیکھ رہے تھے جو اس نے اپنے بندوں سے کیے ہیں۔

میلاد ختم ہونے کے بعد اصغر نے مناجاتیں اور نعتیں شروع کیں۔ پہلے غوث الاعظم کی شان میں قصیدے پڑھے:

غوث الاعظم بہ منے بے سروساماں مددے
قبلۂ دیں مددے کعبۂ ایماں مددے

ہوا سر سرائی اور کھجور کے پتے بھی حمد و ثنا کرنے لگے۔ اور جس وقت اصغر نے مناجات کا یہ شعر پڑھا:

تمنّا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھوں
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا

عین اس وقت نثار احمد کی دل آویز آواز گونج اٹھی۔ اذان سن کر سب پر سکوت طاری ہو گیا۔ پھر سب نے اپنے ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور فاتحہ پڑھ پڑھ کر اپنے گریبانوں میں دم کیا۔ امرتیوں کا تبرک تقسیم ہوا اور اس کے بعد گھر والے رات کے کھانے پینے کے اہتمام میں لگ گئے۔

۱۳

اصغر کی نسبت پکّی ہو جانے کے ہفتہ بھر بعد وحیدہ بیگم نے اپنے بھوپال جانے کی تیاری شروع کر دی۔ بیگم نہال کو جس قدر بیٹی کے آنے کی خوشی ہوئی تھی اسی قدر اُس کے جانے کا ملال بھی تھا۔ بار بار نواسے نواسی کو بلا کر پیار کرتیں بھینچ بھینچ کر اس طرح گلے لگاتیں گویا خدا جانے اب کے بچھڑے دیکھو پھر کب ملیں گے۔

اصغر خوشی خوشی اپنی چیزیں یکجا کر کے رختِ سفر باندھ رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کو یہ دلاسا دے لیا تھا کہ جب ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے قربِ محبوب میسر نہیں تو دیارِ غیر ہی اچھا ہے، یکسوئی تو ہوگی اور وہ در و بام، وہ باتیں تو نہ ہوں گی جو بلقیس کی یاد ہر دم دلا کر اس کو تڑپایا کرتی ہیں۔ وہ مزے سے فرصت کی گھڑیوں میں بلقیس کے تصور سے ہم کنار رہے گا اور یہ تشنہ کامی کے گھٹا ٹوپ سیاہ بادل جو اس کے چاروں طرف چھائے ہوئے تھے، فاصلے سے حسین اور نقرئی نظر آئیں گے۔

کئی دن سے گرمی پڑ رہی تھی۔ دن بھر لو چلتی۔ آسمان سے گرد برستی رہتی۔ جلتے جلتے آسمان کا رنگ راکھ کا سا ہو گیا تھا، اور ڈوبتا ہوا سورج دن

ڈھلے گول طباق کی طرح دکھائی دیتا۔ شام کو لو بند ہو جاتی تو اس قدر حبس ہوتا کہ در و دیوار تندور بن جاتے۔ لیٹ کر بھی آرام نہ ملتا، بچھونے کی چادریں گرم سلاخوں کی طرح برماتیں اور تکیے کاٹتے۔

وحیدہ بیگم کی روانگی سے قبل ہوا یکایک پلٹی اور پُروا چلنے لگی۔ سفید سفید روئی کے گالوں جیسے بادل دوڑے دوڑے آئے اور پورے آسمان پر چھا گئے، جب کہیں گرمی کی ماری دنیا کو کچھ امن ہوا۔ رات بھر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی رہی اور صبح ہوتے ہوتے چھینٹا پڑ گیا۔ لوگ بچھونے لپیٹ لپیٹ کر اندر بھاگے۔ مینڈھے اور دنبے بھیں بھیں کر کے مسلسل چلانے لگے۔ تدّت کی پیاسی زمین میں سے سوندھی سوندھی خوشبو پھوٹنے لگی اور صبح تک موسلا دھار بارش ہو گئی۔ کالی کالی گھنگھور گھٹائیں جھوم جھوم کر پیغام حُسن لے کر آتیں زور شور سے بادل گرجتے اور ٹھہر ٹھہر کر بجلی چمکتی۔ اڑاڑا دھم کا کڑاکا ہوتا اور نیلی اور سُرخ روشنی سیاہ بدلیوں میں لہریئے بناتی ہوئی دور جا کر چمکتی ہوئی نظر آتی۔ ہر شئے دھل دُھلا کر نکھر گئی۔ درختوں کے پتّے گہرے سبز ہو کر زمرّد کے بنے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ ہوا کا مست اور خنک جھونکا ان کو چھیڑتا ہوا گزر جاتا اور رِم جھم بوندوں کے لرزتے ہوئے موتی زمین پر گر جاتے۔ چڑیوں کی چوں چوں، میناؤں کا بولنا اور کوّوں کی کائیں کائیں جو کبھی باعثِ اذیت تھی رُت بدلتے ہی اب کس قدر سُہانی معلوم ہونے لگی۔ کبوتر باز زیادہ ذوق و شوق اور ہماہمی سے کبوتر اڑا رہے تھے اور سودا بیچنے والوں کی تھکی تھکائی آوازوں میں ایک خاص کرارا پن آ گیا تھا۔ محلّے میں عورتیں برسات کے گیت گانے لگیں:

جھولا کن نے ڈالو ری امریاں....

اس کے ساتھ ہی کڑاہائیاں چڑھ گئیں۔ اندر سے اور جھال نکلے جانے کی

خوشبو آنے لگی۔

تن میں تازگی تھی اور من میں اُمنگ۔ مینہ برستے ہی معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے کائنات میں نئی روح پھونک دی ہے انگڑائی لے کر ہر چیز پوری لطافتوں کے ساتھ جاگ اٹھی تھی۔ اور جوان بوڑھے، مرد عورت گھروں سے بیر بہٹیوں کی طرح نکل پڑے کسی نے راہ جنگل کی لی، کسی نے بَن کی۔ کوئی قطب کو چلا کوئی ہمایوں کے مقبرے۔ ان کے ہاتھوں میں پوٹلیاں اور کٹوردان تھے، آموں سے بھری ٹوکریاں تھیں۔ کوئی میٹھے پکوان لے کر نکلا تھا، کوئی سموسے اور کچوریاں لایا تھا۔ کسی کے کٹوردانوں میں ان کا من بھاتا کھاجا برئی ہرا کٹھے اور آم کا اچار تھا۔ عورتیں سپڑ سپڑ جوتیاں اور کھڑاویں کھٹ کھٹ کرتی چلی جارہی تھیں۔ پیٹھ پر پڑے ان کے میلے چیکٹ برقعے جو بھٹیاروں کے رفیدے سے بنے ہوئے تھے ہوا میں اُڑا اُڑ کر ان کے پیچھے گھسٹتے ہوئے چلے جارہے تھے ان کی ہیئت بالکل ایسی تھی جیسے کوئی مرغی پانی میں چوڑا ہو کر اپنے بازو پھڑپھڑا کر پَر سکھاتی ہو۔ بچے رو بھی رہے تھے اور ہنس بھی رہے تھے۔ جگہ جگہ نشیب میں پانی بھر کر ننھے ننھے تالاب بن گئے تھے جن میں پتوں سے ڈھلکی ہوئی بوندیں سینکڑوں گرداب بیک وقت بنادیتی تھیں۔ ان میں لڑکے بالے نہا رہے تھے۔ کاغذ کی کشتیاں بنا بنا کر چھوڑ رہی جارہی تھیں۔ ہر طرف سے مردوں کی حاکما نہ چیخ پکار اور عورتوں کی طول طویل اور بے مقصد باتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس وقت نہ انھیں اپنی ہیئت کذائی کی فکر تھی نہ سراپا کی خبر، نہ غمِ فردا تھا نہ اندیشۂ امروز۔ یہ حُسن کو ترسی ہوئی آنکھیں، یہ ہزارہا محبت کے بھوکے دل جن کو ستم ہلائے روزگار کی چکی برس بھر پیستی رہی تھی زندگی کی کلفتوں کو بھلا کر اپنے چھوٹے چھوٹے گھروندوں اور کثیف گھروں کی قیدوبند سے آزاد ہو کر اس فضا کی تازگی کا لطف اُٹھا رہے تھے جس پر پہلی بارش

نے حسن اور نکھار نچھاور کر دیا تھا۔ زندہ رہنے کی جد و جہد سے نجات پا کر ان کے دلوں میں وہی احساسِ لطیف ٹھاٹھیں مار رہا تھا جو انسان کو قدرت نے عطا کیا ہے۔

اِدھر شہر میں برسات کی بہاریں تھیں ادھر بیویاں وحیدہ بیگم اور اصغر کو گلے لگا لگا کر رخصت کر رہی تھیں۔ بیگم نہال کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی سارے رشتہ داروں نے امام ضامن باندھے کسی نے ناشتے کے لیے روپیے دیے اور کسی نے مٹھائی ساتھ کی۔ میر نہال نے بیٹی کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ وہ بھی آب دیدہ تھے۔ قرآن کی چھاؤں میں سے وحیدہ بیگم اور اصغر نکل کر ڈیوڑھی میں آ گئے سب نے اللہ بیلی کہکر خدا اور اس کے حبیب کو سونپا۔

اصغر نے وحیدہ بیگم کو زنانے ڈبے میں سوار کروا دیا۔ وہ اپنے ڈبے میں آ کر بیٹھا تھا کہ گارڈ نے ہری جھنڈی دکھائی، پلیٹ فارم پر گھنٹہ بجا۔ انجن نے زور زور سے سیٹی دی، بھک بھک دھوئیں کے بادل چھوڑے اور ریل کُو چھکا چھک کرتی دلّی کی سرحدوں کو عبور کرنے لگی۔

وہ جہانِ محبت دور ہوتا جا رہا تھا جس میں اصغر کی محبوبہ رہتی تھی۔ اس وقت اصغر کے دل میں ایک عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ چیلیں آسمان پر بے تکلفی سے تیر رہی تھیں۔ چڑیاں فکر سے آزاد ہل مل کر اُڑ رہی تھیں۔ شجر اپنا سر ہلا ہلا کر کیف و انبساط سے وجد کر رہے تھے اور یہ ہی معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کا دل عشق و محبت سے لبریز ہو کر چھلک پڑا ہے جس سمت نگاہ جاتی تھی، ایک عظمت، ایک حسن اور رعنائی کی بادشاہت نظر آتی تھی۔ دور، بہت دور، اُفق کے اس کنارے بادلوں کی گرج اور چمک صلح و آشتی کے نقارے بجا رہی تھی۔ دیوتاؤں کا غیظ و غضب مٹ چکا تھا۔ کام دیوتا کے آتے ہی قدرت کی دیوی اپنے ہاتھ پھیلا کر نئے وجود کی دعا دے رہی تھی اور دنیا کو حیاتِ نو بخش دی تھی۔